

# سُغْلَمُ کَسَن

مَنْشِ پَرِکَم چَند



# شعلہ حسن



منشی پریم چند



چوبداری الیڈ می

۳۰۵۔ ذوالقرنین چیمبرز گنٹ روڈ لاہور

ناشر ————— محمد خالد چوہدری

اہتمام ————— میاں محمد اسلم

مطبع ————— الفریڈ پرنٹنگ پریسی لاہور

قیمت ————— 30/- روپے صرف

چوہدری اکیڈمی - لاہور

# سنک فہر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچہ	۴
۲	شعلہ حسن	۷
۳	دھوکا	۲۸
۴	سوت	۴۱
۵	سر پر غرور	۵۷
۶	اصلاح	۷۰
۷	آتما رام	۸۶
۸	بینک کا دیوالیہ	۱۰۳
۹	ایمان کا فیصلہ	۱۴۰

## دیباچہ

تاریخ ادبیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند ان چند گنے چنے ادیبوں میں ہیں جنہوں نے قصہ گوئی اور صغیم داستانوں سے مہٹ کر زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کو موضوع بنایا۔ تلخ اور شریں واقعات جن سے عام آدمی متاثر ہوتا ہے۔ مخصوص اور منفرد انداز میں قلم بند کیے ہیں۔ ان کی نثر میں عقلیت۔ مقصدیت۔ استدلال اور سادگی ہے۔ انہوں نے علمی۔ مذہبی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور سماجی موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ مقصدیت کی وجہ سے اسلوب اور زینت الفاظ پر کم تو بہ صرف کی۔ تاہم ان کی تحریروں میں روانی سادگی۔ سچائی اور خلوص ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کی داغ بیل ڈالی اور اسے بامعروج تک پہنچایا۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ سوچے سمجھے ہوتے ہیں۔ فنی اور واقعاتی ربط اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ مقصدیت کا دامن بھی نار تار نہیں ہوتا۔ جگلے چھوٹے اور بامعنی ہوتے ہیں۔ ان کی بندش نہایت جامع و دلکش اور جاذب ہوتی ہے۔ استعارات۔ تشبیہات اور تلمیہات کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں میں معاشرہ۔ فرد۔ سماج۔ قوم اور ملک کی اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ افسانوں میں کہیں جھولی نظر نہیں آتا۔

میانہ ردی اور دلچسپ زبان و بیان سے ان کو ادہ اور عام فہم بنایا کہ ہر کس و نا کس استفادہ کر سکتا ہے۔ افسانوں کا نثر بیان بالکل اچھوتا ہے

جدت اور زبردت کو لائحہ سے نہیں جانتے دیا۔ ہر افسانے میں نئی بات نئے  
 ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ ان کو دیکھ کر خاص قسم کی راحت اور خوشی محسوس  
 ہوتی ہے۔ حقائق اور واقعات اس چابک دستی سے بیان کیے گئے ہیں  
 کہ نہرل اور محسوس کا شائبہ ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان میں نکھار اور پاکیزگی ہے  
 خیالات۔ جذبات۔ تجربات اور مشاہدات سلیقے سے پیش کرتے ہیں کہ قاری  
 لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ روزمرہ کے بول چال میں دقیق اور  
 پیچیدہ مسائل، شستہ اور رفتہ زبان میں بیان کیے ہیں کہ معمولی قابلیت  
 کا آدمی بھی استفادہ کر سکتا ہے۔

منشی پریم چند چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں یدِ لکھنؤ کہلاتے ہیں لیکن  
 آپ کے افسانوں کا اس زمانے کی نام نہاد قصوں سے دور ہر واسطہ ہمیں  
 انہوں نے الفاظ کی بندش بیان کی روانی سے چھوٹے بڑے واقعات اور  
 تاثرات اس طرح پیش کیے ہیں کہ نکاہوں کے سامنے واقعات و احوال مہر  
 کینچ جاتی ہے۔ ان کی تحریر تین خصوصیات کی حامل ہے۔ اول مطالعہ فطرت  
 دوم روزمرہ واقعات کا بیان، سوم اندازِ بیان۔ ان تینوں خصوصیات  
 کے مجموعے کو پریم چند نے قلم کے جادو سے آواز و دربار بنایا ہے کہ قاری  
 ان کے ایک ایک لفظ پر مسحور ہو جاتا ہے۔ تن بدن میں اختیار نہیں  
 ہوتا کہ وہ ان افسانوں کے اثر سے متاثر نہ ہو۔ افسانوں میں تجربات کی  
 اہمیت سے روگرافی نہیں کی گئی۔ تفصیلات اتنی طویل نہیں کہ افسانوں  
 میں واقعات اور مقصدیت کو ہی لے ڈوبیں۔ ان کے ہاں واقعات

کے بغیر افسانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ افسانہ ہر حال میں افسانہ رہتا ہے۔ انہوں نے افسانے کو کبھی خاکہ نہیں بننے دیا۔ نفسیاتی فحزریوں کی بجائے واقعات اور حقائق کا سہارا لے کر افسانوں کو لافانی اور زندہ بنادیا۔ افسانے اتنے بھرپور ہیں کہ مختلف ادوار گزرنے کے باوجود ان کے افسانوں کی افادیت میں رتی بھر فرق نہیں پڑا اور وہ اب بھی جدیدیت اور ترقی پسندیت کے دور میں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں پریم چند کے کچھ افسانے پیش کیے جا رہے ہیں، قارئین ان سے مفید استفادہ حاصل کر سکیں گے۔

میاں محمد رفیق

---

# شعلہ حسن

(۱)

ڈگڑی لینے کے بعد میں قریب قریب روز پبلک لائبریری جایا کرتا تھا۔ اخبار دن اور کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے نہیں کتابوں کو تو میں نے چھوٹے کی قسم کھالی تھی جس دن گزرتے میں اپنا نام دیکھا اسی دن مل اور کنیٹ کے پُرزے پُرزے کر دیئے میں صرف اسٹیشنر اور پائونیر کے ”ڈائنڈ“ کالموں کو دیکھا کرتا تھا۔ فکر معاش دانشگیر تھی۔ میرے دادا نے بغاوت کے زمانے میں کسی انگریز افسر کی جان بچائی ہوتی۔ یا قبضہ میں کثیر موروثی جائیداد ہوتی تو کسی معزز عہدے کے لیے کوشش کرتا۔ اب میرے لینے بجز زندگی کے دن کاٹنے کے اور کیا تھا؟ معلوم نہیں لیڈر میں ایسے اشتہارات کیوں نہیں



ہوتے۔ اخبار اشتہاروں کی آمدنی پر چلتے ہیں۔ یہاں کی ضرورتیں اسکول ماسٹروں تک ختم ہو جاتی ہیں۔ کیا ہمارے فیشن ایبل ہندوستانیوں کو گھوڑوں اور موٹروں اور کتوں اور زیوروں کی خرید و فروخت کی ضرورت نہیں ہے؟ غالباً یہ لوگ اپنی ضرورتیں انگریزی اخباروں سے پوری کرتے ہوں گے۔ خیر مہینوں اسی طرح دوڑتے گزر گئے۔ اپنے مزاج کے موافق کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مجھے اکثر اپنے بی۔ اے ہونے پر غصہ آتا تھا۔ کاش ڈرائیور یا فائرمین۔ خانسا مال یا بادوچی ہوتا تو مجھے اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔

آخر ایک روز مجھے اپنی مرضی کے موافق ایک ”مانگ“ نظر آئی کسی رئیس کو ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ جو اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ۔ رنگین طبع۔ خوش مذاق اور وجہ ہو۔ تنخواہ ایک ہزار۔ درخواست کے ساتھ فوٹو بھی طلب کیا گیا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ کاش تقدیر یاوری کرتی! اور یہ منصب میرے ہاتھ آتا۔ تو زندگی چین سے کٹ جاتی! اسی دن درخواست مع فوٹو روانہ کر دی مگر اپنے احباب سے اس کا ذکر نہ کیا کہ کہیں سخت نہ اٹھانی پڑے۔ دل ہر دم اسی خیال میں ڈوب رہتا۔ بیٹھے بیٹھے شیخ جلی کے منصوبے باندھا کرنا۔ پھر نوش میں آکر اپنے تئیں سمجھاتا کہ مجھ میں ایسے جلیل منصب کے لیے کونسی قابلیت ہے؟ میں ابھی کالج کا نکلا ہوا کتبی اصولی انسان ہوں۔ دنیا سے بے خبر۔ اس جگہ کے لیے ایک سے ایک عالم۔ فاضل منہ پھیلائے

بیٹھے ہوں گے۔ میرے لیے کوئی امید نہیں۔ میں خوش رو سہی۔ سبھیلا سہی۔ مگر ایسے عہدوں کے لیے محض خوش رو ہونا کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے مکھنے کا منشا صرف اتنا ہو گا کہ سائل کو صرف کمزور نہ ہونا چاہیے اور یہی معقول بھی ہے بلکہ بہت سبھیلا پن تو مناصب گرامی کے لیے کچھ خلاف شان ہے۔ مختصر سا توند۔ بھرا ہوا بدن۔ پھولے ہوئے رخسارے اور حکمانہ انداز تقریر یہ حکومت اور رعب کے لوازمات ہیں۔ اور مجھے ان میں سے ایک بھی بیستر نہیں۔ میرے لیے کیا امید ہو سکتی ہے؟ اسی امید و بیم کی حالت میں ایک ہفتہ گزر گیا اور اب میں بالکل مایوس ہو گیا۔ سوچا میں بھی کیسا احمق ہوں کہ ایسی بے سر پیر کی بات کرتے پیچھے پھولی اٹھا۔ اسی کو نوٹ اپن کہتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس اشتہار کی کوئی اصلیت نہیں۔ کسی ستم ظریف نے آج کل کے تعلیم یافتہ آدمیوں کی حماقت کا امتحان لینے کے لیے یہ شگوٹہ چھوڑا ہے۔ میں بھی کتنا کوتاہ اندیش ہوں کہ یہاں تک بھی مکاہ نہ پہنچی۔ آٹھویں دن علی الصبح نار کے چپڑا سی نے مجھے آواز دی۔ میرے کلیجہ میں گدگدی سی ہونے لگی۔ لپکا ہوا آیا۔ نار کھول کر دیکھا۔ لکھا تھا منظور ہے۔ فوراً آؤ۔ عیش گڑھ؛ مگر اس نار کے ملنے سے مجھے وہ خوشی نہ ہوئی جس کی امید تھی۔ میں اُسے لیے کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اعتبار نہ آتا تھا۔ ضرور کسی ستم ظریف کی شرارت ہے مگر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے بھی اس کا ذہان شکس جواب دینا چاہیے کیوں

نہ تار دیدوں ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی بھیج دو۔ آپ ساری کیفیت کھل جائے گی لیکن پھر سوچا کہ میں فی الواقع طالع خفہ بیدار ہوا ہوتا تو اس قسم کی حماقت سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چلو دل لگی سہی۔ زندگی میں یہ واقعہ بھی یاد رہے گا۔ اس طلسم کو کھول ہی ڈالوں۔ فوراً تار سے اپنی روانگی کی تاریخ کی اطلاع دی اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دریاقت سے معلوم ہوا کہ یہ مقام دکن کی طرف ہے۔ ٹائم ٹیبل میں اس کا ذکر مفصل لکھا تھا۔ مقام بہت خوش منظر سیر کے قابل ہے۔ آب و ہوا بہت اچھی نہیں مگر مضبوط جسم کے نوجوانوں پر اس کا اثر دیر میں نظر آتا ہے وادیاں تاریک ہیں۔ ان میں گھسنا خطرناک ہے۔ کیونکہ زہریلے جانور بہت چھپے رہتے ہیں۔ غرض حالات کافی طور پر اشتیاق انگیز تھے۔ اگر مختصر سامان سفر درست کیا اور خدا کا نام لے کر چل کھڑا ہوا۔ اپنے غریبوں اور دوستوں سے اس کا مطلق ذکر نہ کیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ دو چار دن میں اپنا سامانہ لیے لوٹوں گا۔ اس وقت شہادت ہمسایہ کا خوف نہ ہو گا

(۲)

گاڑی پر بیٹھا تو شام ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سگارا اور اخبار سے دل بہلاتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی اور کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکا تو صبح کا دل فریب نظارہ دکھائی دیا۔ دونوں طرف سبزہ سے ڈھکے ہوئے کہسار تھے۔ ان پر چرتی ہوئی اُجلی اُجلی گائیں اور بھیریں آفتاب کی سنہری شعاعوں میں رنگی ہوئی ایسی معلوم

ہوتی تھیں۔ جیسے ندی میں چمکتے ہوئے تارے۔ جی جانتا تھا۔ کاش  
میرا آشیانہ بھی انہیں پہاڑیوں میں ہوتا! جنگل کے پھل کھاتا۔ جھرنوں  
کا خوشگوار پانی پیتا اور قدرت کے گیت گاتا۔ دفعۃً منظر بدلا۔ ایک  
وسیع پھیل پہاڑوں کے دامن میں نظر آئی۔ کہیں مرغابیاں تیرتی تھیں۔  
کہیں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں۔ ارادہ کنزدر کی طرح ڈنگاتی ہوئی چلی جاتی  
تھیں۔ یہ منظر بھی بدلا۔ پہاڑیوں کی گود میں ایک آباد گلزار کاؤں نظر آیا۔  
جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا ہوا جیسے طاڑوں نے درختوں پر عافیت  
کے آشیانے بنائے ہوں۔ کہیں بچے کھیلنے تھے۔ کہیں کائے کے پھڑپھڑے  
کلیس کر رہے تھے۔ پھر ایک گھنا جنگل ملا۔ غول کے غول ہرن نظر آئے  
جو گاڑی کی آواز سنتے ہی چوڑیاں بھرتے دور بھاگتے تھے۔ یہ سب مناظر  
نواب کی تصویروں کی طرح نظر آتے تھے اور آنکھوں سے چھپ جاتے تھے  
ان میں ایک ناقابل بیان شاعرانہ دلاویزی تھی۔ جودل میں حسرت اور  
شوق کا بھادو بھونکتی تھی۔

آخر عیش گڑھ قریب آیا۔ میں نے بستر سلجھا لیا۔ ذرا دیر میں ایشی  
کا سگسل دکھائی دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گاڑی رکی۔ میں  
نے ادھر ادھر قبیلوں کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ کہ دو وردی پوش آدمیوں  
نے اگر مجھ سے پوچھا۔ آپ ہی..... سے تشریف لارہے ہیں؟ چلے  
موٹر حاضر ہے۔ میری باجھیں کھل گئیں حکمانہ انداز سے موٹر پر جا بیٹھا  
دل میں نام تھا کہ اسباب اور لباس اس سے بہتر کیوں نہ ہوئے۔ اگر

جانتا کہ ستارہ سچ مچ چمکا ہے تو ہرگز اس پر نشانِ عالی سے نہ آتا۔ موٹر  
چلا۔ دور وہ مولسزبوں کے سایہ دار درخت تھے۔ سڑک پر سرخ بھی ہوئی  
تھی۔ دونوں طرف سبزہ زار تھا۔ سڑک کمان کی طرح خم کھاتی۔ اس  
میدان سے نکل گئی تھی۔ دفعۃً سامنے ایک پُر فضا سا گر دکھائی دیا۔  
اور ساگر کے اُس پار پہاڑیوں پر ایک عالی شان محل تھا جس کا شکوہ  
درخشاں پرستان کی یاد دلانا تھا۔ محلِ حرصِ رفعت کی طرح غرور سے  
سراٹھائے ہوئے۔ جھیل گوشہٴ قناعت کی طرح متین اور پرسکون  
سارا منظر نغمہ اور حسن اور شعر کا مسکن معادِم ہوتا تھا۔

ہم صدر دروازہ پر پہنچے۔ کسی خدمتہ کاروں نے آکر ہمارا خیر مقدم  
کیا۔ ان کے ساتھ ایک غشی جی آنکھوں میں سرمہ لگائے کا کلیں سنوارے  
نظر آئے جو مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ میرے لیے ایک کمرہ پہلے  
ہی سے آراستہ تھا۔ غشی جی نے مجھے اس کمرہ کے دروازہ پر پہنچا دیا۔  
اور بولے۔ سرکار نے فرمایا ہے۔ اس وقت آپ آرام فرمائیں تکلیف  
کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شام کو تشریف لائیے گا۔

مجھے اب تک خبر نہ تھی کہ سرکار کون ہیں۔ نہ کسی سے پوچھنے کی جرات  
ہوئی۔ اپنے آقا کے نام تک سے بے خبر رہنے کا الزام نہیں لینا چاہتا  
تھا مگر چاہے کوئی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص شرافت کا  
تپلا ہے۔ مجھے اتنی خاطر مدارات کی ہرگز امید نہ تھی۔ اپنے کمرہ میں آرام  
کر سہی پر لیٹا تو مسرت سے میری آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ سامنے چھبچھا

تھا۔ نیچے جھیل تھی۔ سانپ کے کچل کی طرح سیاہ و سفید۔ اور میں جسے  
تقدیر نے ہمیشہ اپنا سوتیلا لڑکا سمجھا تھا۔ اس وقت زندگی میں پہلی بار  
خالص مسرت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دائے بے خبری۔

سر پہر کو سرمہ باز غشی جمانے آکر اطلاع دی کہ سرکار نے یاد  
فرمایا ہے۔ میں نے اس اثناء میں خط صاف کر لیے تھے۔ پھر اپنا  
بہترین سوٹ پہنا اور سرکار کی خدمت میں چلا۔ اس وقت دل  
میں ایک قسم کی کمزوری محسوس ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنی قابلیت  
کا بہترین اظہار کرنے کے لیے تیار تھا۔ ہم کئی برآمدوں سے ہوتے  
ہوئے آخر کار سرکار کے دروازے پر پہنچے۔ ایک ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔  
غشی جی نے پردہ اٹھا کر مجھے اشارہ سے بلایا۔ میں اندر داخل ہوا اور  
حیرت سے ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے حسن کا ایک شعلہ دہک  
رہا تھا۔

(۳)

پھول میں بھی حسن ہے۔ شعلہ میں بھی حسن ہے۔ پھول میں طراوت  
اور تازگی ہے۔ شعلہ میں سوز اور تپش۔ پھول پر بھونرا اڑا اڑا کر  
اس کا رس لیتا ہے۔ شعلہ پر پروانہ چل کر اکھ ہو جاتا ہے۔ میرے  
سامنے اس وقت زنگار مند پر جو نازنین شان سے بیٹھی ہوئی تھی۔  
وہ فی الواقع حسن کا شعلہ تھی۔ اس کی مخمور آنکھوں سے جانسوز حرارت  
کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ پھول کی پتکھڑیاں ہو سکتی ہیں۔ شعلہ کو بکھیرنا

ممکن نہیں۔ اس کے ایک ایک عضو کی تعریف کرنا شعلہ کو کاٹنا ہے  
اس کا سزنا یا ایک شعلہ تھا۔ وہی دمک۔ وہی سُرخ۔ کوئی مصوّر  
سطوت حسن کی اس سے بہتر تصویر خیال میں نہیں لاسکتا۔

اس نے میری طرف مربیانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ آپ کو دوران  
سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

میں نے اپنے تئیں سنبھال کر جواب دیا۔ جی نہیں کوئی خاص تکلیف  
نہیں ہوئی۔

نازنین۔ یہ مقام پسند آیا؟

میں نے دلیرانہ سرگرمی سے جواب دیا۔ اس سے زیادہ دل کش  
مقام روئے زمین پر نہ ہوگا۔ ہاں گامد بک سے معلوم ہوا کہ یہاں  
کی آب و ہوا بظاہر بخشنی خوشگوار ہے فی الواقع ایسی نہیں۔ کچھ خطرناک  
جانوروں کی بھی شکایت تھی۔

نازنین کا چہرہ زرد ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم میں  
رعشہ آگیا۔ مگر دم زدن میں اس کے چہرہ پر پھر اسی غرور منانیت کا جلوہ  
نظر آیا۔ بولی۔ یہ مقام اپنی خوبیوں کے باعث اکثر حاسدوں کی آنکھوں  
میں کھٹکتا ہے۔ ہنر کے حاسد بہت ہوتے ہیں اور بالفرض آب و ہوا  
میں کچھ نقص ہو بھی تو ماشاء اللہ ابھی آپ کا عالم شباب ہے۔ آپ کو  
اس کا کیا غم ہو سکتا ہے۔ رہنے رہے ہر لیے جانور۔ وہ آپ کی نظروں کے  
سامنے موجود ہیں۔ اگر مور اور ہرن اور سنس زہریلے جانور ہیں۔ تو

بے شک یہاں زہریلے جانوروں کی کثرت ہے۔

یہ کہہ کر اس نے میری طرف متانہ نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے جوش کے ساتھ جواب دیا۔ ان گامد بکوں پر اعتبار کرنا سراسر جہل اور

حمالت ہے۔

اس جملے سے نازنین کے دل پر کوئی خاص اثر ہوا۔ بولی آپ صاف گو معلوم

ہوتے ہیں۔ اور یہ انسان میں ایک جوہر ہے۔ میں آپ کی تصویر دیکھتے ہی اتنا سمجھ

گئی تھی۔ آپ کو سن کر تعجب ہو گا۔ کہ میرے پاس ایک لاکھ سے زائد درخواستیں آئی

تھیں کہتے ہی ایم۔ اے تھے۔ کوئی ڈی۔ ایس۔ سی تھا۔ کوئی انگلستان سے پی۔ ایچ

ڈی کی ڈگری پاچکا تھا۔ گویا یہاں مجھے کسی ریاضی یا عملی مسئلہ کی تحقیقات مد نظر

نہ تھی۔ کئی بزرگوں نے اپنی کمرسنی کی بنا پر درخواست کی تھی۔ جن کی دوا دارو کے

یہ مجھے حکیموں کی ضرورت ہوتی۔ سب سے زیادہ درخواستیں انہیں لوگوں کی

تھیں۔ جو کتاب کے کیڑے ہوتے ہیں۔ اور آداب و اخلاق کے سرالایا کرتے ہیں۔

ان کی دانست میں اس ملک میں سب سے زیادہ ضرورت عابدوں اور مولویوں

کی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں حضرات نے اس ملک کا ستیاناس کیا ہے

اخلاقی تعلیم کا اب زمانہ نہیں رہا۔ روایات قدیم قصہ کہانیوں کے لیے مخصوص ہیں۔

یہ زمانہ مادیت اور مادی تعلیم کا ہے۔ جب کہ لوگ سامان عیش پر اپنے تئیں قربان

کر دیتے ہیں۔ میں نے وہ سب درخواستیں رد کی کی ٹوکری میں ڈال دیں پس کبھی

ہوں۔ سینکڑوں درخواستیں انہیں اخلاقی رفتار مردوں کی تھیں۔ وہ اپنی تصانیف

کو سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔ صورتیں ایک سے ایک قابل دید! جنہیں دیکھ کر



گھنٹوں ہنسے۔ میں نے انہیں ایک البم میں لگا دیا ہے۔ اور فرصت کے وقت جب ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ تو انہیں دیکھا کرتی ہوں۔ وہ علم اور کمال جو چہرہ کو بگاڑ دے۔ اور انسان سے بن مانس بنا دے، مرض ہے۔ آپ کی تصویر دیکھتے ہی میری نظر انتخاب نے فیصلہ کر لیا۔ اور شکر ہے کہ میری نگاہ نے غلطی نہ کی۔ اس نے میری طرف چہنہائے پر خوں سے دیکھا۔ اس کی آواز میں غم کی تاثیر تھی۔ نورانی اور دلادیز، اور اس کے خیالات نئی روشنی کے خیالات تھے حقیقی لباس میں، برہنہ اور ہولناک مگر اس آخری جملہ نے جو مجھ سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے متوالا کر دیا۔ میری رگوں میں رعشہ سا آگیا۔ معلوم نہیں کیوں؟ معنوی خوبیوں کے مقابلہ میں ظاہری اور صاف کی تعریف سے ہم زیادہ مخطوط ہوتے ہیں۔ اور ایک حسینہ کی زبان پر تو وہ چلتا ہوا جادو ہے۔ میں بولا، حتی الامکان جناب کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقع نہ ملے گا۔

حسینہ نے معترف انداز سے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ مجھے اس کا یقین ہے میری قیامت شناسی نے اتنا پہلے ہی بتلادیا تھا۔ اب کچھ معاملہ کی گفتگو ہو جانی چاہیے یہاں آپ میرے ہمارے رہیں گے۔ اس جھونپڑے کو خانہ بے تکلف سمجھئے۔ میرے تعلقات نہایت وسیع ہیں۔ دنیا کے ہر ایک گوشہ میں میرے کرم فرما موجود ہیں۔ اور مجھے اکثر یاد کیا کرتے تھے۔ ان اجاب کو میں آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ ان میں آپ مختلف مزاج اور خواص کے انسان پائیں گے۔ کوئی مجھ سے مدد مانگتا ہے۔ کوئی میری شکایت کرتا ہے۔ کوئی مجھے سراہتا ہے۔ کوئی مجھ کو ستا ہے۔ اب سب حضرات کو شافی جواب دینا آپ کا کام ہو گا۔ دیکھئے۔ یہ آج کے خطوط کا انبار ہے۔

ایک صاحب فرماتے ہیں، بہت عرصہ ہوا، آپ کی تحریک سے اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب ان کا لڑکا بالغ ہو گیا ہے اور مجھے اپنی جائیداد کی واپسی کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اتنے عرصے تک میں اس جائیداد پر قابض تھا۔ اس سے دست بردار ہونا شاق گزرتا ہے۔ اب آپ کے شورہ کا منظر ہوں۔ انہیں جواب دیکھئے کہ فی الحال لطائف الحیل سے کام لو لڑکے سے ہمدردی ظاہر کرو، اسے ملالو۔ تب اسے غافل پاکر اس سے ایک سادے اسٹاپ پر دستخط کرا لو۔ بعد ازاں پٹواری اور دیگر عمال کی مدد سے اس اسٹاپ پر جائیداد کا بیعنامہ لکھاؤ۔ اگر ایک خرچ کر کے دو ملتے ہوں تو تامل نہ کرو۔

مجھے اس جواب پر سخت حیرت ہوئی۔ اخلاقی احساس کو چوٹ سی لگی۔ اس کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ یہ تو انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ نانہن کھل کھلا کر ہنسی پڑی۔ اور بولی۔ انصاف! یہ کتابی عالموں کا ایجاد کیا ہوا گورکھ دھندا ہے۔ دنیا میں اس کا وجود نہیں، باپ قرض کھا کر مر جائے۔ لڑکا کوڑی کوڑی بھرے۔ علماء کے نزدیک یہ انصاف ہے! میں اسے ظلم کہتی ہوں۔ اس انصاف کے پر وے میں گانٹھ کے پورے ہاجن کی دست درازی صاف نظر آتی ہے۔ ایک ڈاکو کسی سرکاری عملے کے گھر میں ڈاکہ مارتا ہے اور گرفتار ہو کر جیل خانے جاتا ہے۔ علماء سے انصاف کہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی وہی دولت اور حکومت کی زبردستی ہے۔ عملے صاحب نے کتنے ہی گھروں میں ڈاکا مارا۔ اور کتنوں ہی کا گلا دبا دیا۔ اور اس طرح روپیہ کا انبار جمع کیا۔ کسی کو ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ڈاکو نے جب ان کا گلا دبا یا تو وہ اپنی دولت، ہوشیاری

چالاکی، فریب اور طاقت کا راج ہے۔ یہی کارزار ہستی ہے۔ یہاں ہر ایک تدبیر جس سے ہمارا کام نکلے جس سے ہم اپنے دشمنوں پر ظفر پاف ہوں۔ جائز اور مباح ہے۔ دھرم یدھ کے دن اب نہیں رہے۔ یہ دیکھیے، ایک دوسرے صاحب کا شکایت نامہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ میں نے اول میں ایم۔ اے پاس کیا۔ اول درجہ میں قانون کی سند حاصل کی ہے۔ پر اب کو میری بات نہیں پوچھتا۔ اب تک یہ بدعتی کہ قابلیت اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ مگر تین سال کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ فرض کتابی قانون ہے۔ اس مرحلہ میں بزرگوں کی کمائی بھی گاؤں خور ہو گئی۔ اب مایوس ہو کر آپ نے آستانہ پر فرق نیاز جھکاتا ہوں۔ مجھ بد نصیب کے حال زار پر رحم کیجیے۔ اور میرا بیڑا پار لگا بیٹے۔ انہیں جواب دیجیے کہ جعلی رستادریز بنائیے۔ اور فرضی موٹلوں کی طرف سے دعویٰ دائر کر کے ڈگری کرا لیجیے۔ یقیناً چند ماہ میں آپ کی نحوست دور ہو جائے گی۔ یہ دیکھئے، ایک اور صاحب فرماتے ہیں۔ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ جہاں جاتا ہوں۔ لوگ جینز کی گٹھری مانگتے ہیں۔ یہاں نان شینہ کا ٹھکانا نہیں کسی طرح و صنداری نبھاتا ہوں، بدنامی ہو رہی ہے۔ جیسا ارشاد مو تقیل کروں۔ انہیں لکھیے، کسی ہفتاد سالہ صاحب جاندا بوڑھے سے شادی کر دیجیے۔ وہ جینز لینے کی بجائے دینے پر تیار ہو جائے گا۔ میرے خیال میں اب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ ایسے سائلوں کو کس قسم کا جواب دینے کی ضرورت ہے؟ جواب مختصر ہوں۔ بہت زیادہ توجہ اور تشریح کی ضرورت نہیں۔ ابھی چند روز یہ کام آپ کو مشکل معلوم ہو گا۔ اکثر کاموں میں آپ کو غور و خوص سے کام لینا پڑے گا۔ مگر آپ طباع آدمی ہیں۔ بہت جلد بھارت ہو جائے گی۔

آپ کی ذات سے ہزاروں بندگانِ خدا کا بھلا ہو گا۔ اور وہ آپ کا جس کا میں ہے۔

— (۴۷) —

مجھے یہاں رہتے ایک ماہ کے قریب ہو گیا۔ مگر اب تک مجھے یہ نہ معلوم ہوا۔ کہ میں کس کا نمک خوار ہوں۔ وہاں دولت کی کمی نہ تھی۔ نگاہات کے سامان وافر کچے سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ دولت کہاں سے آتی ہے؟ ایک بار سرمہ بار منشی جی سے میں نے اشارۃً اس کا ذکر چھیڑا تھا۔ انہوں نے کہا ان کے ذرائع غیر محدود ہیں۔ دنیا کے ہر ایک گوشہ میں ان کے سرید موجود ہیں۔ وہ انہیں نذریں دیا کرتے ہیں۔ اس سے میں نے یہ اخذ کیا تھا کہ شاید یہاں میری سریدی کا کوئی سلسلہ ہے۔ مگر نازنین کون ہے؟ آیا کوئی خوش نصیب پروانہ ہے جو اس شعلہ پر نثار ہوتا ہے؟ یہ راز سر بہتہ ہی رہا۔ مجھے قریب قریب روز اس سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ آہ! اس کے ردِ پروا بیٹھ کر میں کبے خود ہو جاتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں نہ بردست قوت جاذبہ تھی جو میری روح کو رگوں سے کھینچ لیا کرتی تھی۔ میرا یا مائے گفتار سلب ہو جاتا تھا۔ بس چھپی ہوئی۔ دزدیدہ آنکھوں سے تاکا کرتا۔ وہ بھی مجھ سے غیر ملقت نہ تھی۔ پروانہ معلوم کیوں۔ مجھے اس کی ہر انگیر انگلی ہوں آخر پر شوق کنایوں میں محبت کی جھلک نظر نہ آتی تھی؟ نگاہیں تیر کی طرح عذرت چھیدتی تھیں مگر بے تاب کرتے تھے۔ شکاری کو اپنا شکار کھلانے میں جو لطف آتا ہے۔ وہی بے رحمانہ مسرت اس نازنین کو میری دادرہنگی سے حاصل ہوتی تھی وہ شعلہ دل بے تاب کو کیا تسکین دے سکتا ہے؟ باوجود اس کے میں پروانہ دار اس شعلہ پر نشاندہ ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اب تک عشاق کا مریخ بھل کی طرح تپتا پتا محبت کا شعلہ

تخیل معلوم ہوتا تھا۔ پر اس وقت میری بعینہ یہی حالت تھی جی چاہتا تھا کہ کسی طرح ان قدموں پر سر رکھ کر جان دے دوں۔ رفعت حسن نے دل سے شوق اور تمنا کو مٹا کر صرف جا بجا بازی کی حسرت رکھ چھوڑی تھی کبھی کبھی جب وہ اپنے تیز و موٹر بوٹ پر بیٹھ کر ساگر کی سیر کرتی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا شفق میں چاند تیر رہا ہے۔

اپنے کار منصبی میں مجھے اب کافی مہارت ہو گئی تھی۔ روز خطوط کا ایک دفتر میرے پاس آتا معلوم نہیں کس ڈاک سے ان پر مہر کا کوئی نشان نہ ہوتا تھا۔ مجھے ان سالکوں میں اکثر وہ اسمائے گرامی نظر آئے جن کی اب تک میرے دل میں بچی عزت تھی۔ کہتے ہی ایسے حضرات تھے جن کی میں پرستش کرتا تھا، بڑے بڑے نامور پروفیسر، اور مصنف، بڑے بڑے صاحب ثروت، روسا حتیٰ کہ کتے ہی ہادیان مذہب روز اپنی مصیبت کی داستان سناتے۔ ان کی حالتیں واقعی قابلِ رحم تھیں۔ مجھے رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ابتداء آفرینش سے باوجود لاکھوں صدیاں گزر جانے کے انسان ویسا ہی وحشی، ویسا ہی غصب ناک، جذبات کا غلام ویسا ہی خود غرض، ویسا ہی خونخوار بنا ہوا ہے۔ ہادیان دین اور علمائے اخلاق کی کوششیں مطلق کامیاب نہیں ہوئیں۔ بلکہ اس زمانہ میں لوگ سادگی کے باعث اس قدر کمینہ پرست، اس قدر بغض پرور اور اپنی سفاکیوں میں اس قدر ہنرمند اور چالاک نہیں تھے۔ ان میں کتنے ہی خطوط شکریہ کے ہوتے تھے۔ اکثر جیٹھیاں ان لوگوں کی ہوتی تھیں جو کسی سابقہ موقع پر اس نازنین کے مشورہ پر عمل کر چکے تھے۔ اور اب اس کے نتائج بھگت رہے تھے۔ وہ زیادہ تر دشنام اور لعن طعن

سے پر پہنچتی تھیں۔ ایک روز اپنے کالج کے ایک پروفیسر صاحب کا خط ملا یہ حضرت سب پروفیسروں سے زیادہ نیک نام تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ان کا نام اعمال از سر تا پایا سیاح تھا۔ ان خطوط کو دیکھ کر اس تاریک، متعفن لپتی کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ جہاں تک انسان جاسکتا ہے۔ ایک ایک خط بھرت کا دفتر تھا۔ اور دائے بر حال من! محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے میں انسانی اور روحانی فرائض کو طاق پر رکھ کر گمراہیوں کا آلہ تاریک بنا ہوا تھا۔ معلوم نہیں مجھ بد نصیب کے ہاتھوں کتنے گھرباہ ہوئے ہوں گے۔ اور کتنی زندگیاں خاک میں مل گئی ہوں گی۔

ایک روز شام کے وقت نازنین نے مجھے یاد کیا۔ میں اپنی شوریدہ سری کے زلم میں سمجھتا تھا کہ میرے مردانہ چشن اور بانگین کا اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ہوتا۔ اپنا بہترین سوٹ پہنا۔ بال سنوارے اور متین لاپرواہی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اگر وہ مجھے اپنا شکار بنا کر کھیلتی تھی تو میں بھی شکار بن کر اسے کھلانا چاہتا تھا۔ اگر وہ جفا کار تھی تو میں بھی اس کی تاثیر حسن سے متاثر نہ ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر میں اسے رحم سمجھتا تھا تو اسے بھی مجھے بے نیاز سمجھنے میں کوئی امر مانع نہ ہو سکتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک دلاویز تبسم سے میرا استقبال کیا۔ بگوچہرہ کچھ مضمل تھا میں بے تاب ہو کر بولا۔ کیا دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟

اس نے حیرتناک انداز سے جواب دیا۔ جی ہاں! قریب ایک ہفتہ سے ایک درد لاحق ہو گیا ہے۔ اب تک طبیعت کو سنبھالتی رہی۔ پر اب مرنے روز پکڑتا جاتا ہے۔ اس کی دوا ایک بڑے بڑے جسم آدمی کے پاس ہے۔ وہ مجھے روز تڑپتے

دیکھتا ہے۔ اور اس کا دل ذرا بھی نہیں پسپتا۔“

میں کنایہ سمجھ گیا۔ بدن کی ایک ایک رگ میں بجلی کی سی حرکت ہو گئی، تنفس میں طوفان اُگیا۔ بے باک ہو کر بولا۔ ممکن ہے۔ جسے آپ نے بے رحم سمجھ رکھا ہے۔ اُسے آپ سے بھی یہی شکایت ہو۔ مگر حالات سے مجبور ہو کر حرف شکایت زبان پر نہ لاسکتا ہو۔

حسین نے کہا تو کوئی ایسا علاج بتائیے جس سے طرفین کی شکایتیں رفع ہو جائیں۔ بے تابی درد نے مجھے بتا دیا ہے۔ میرے دل میں زیادہ پردہ داری کی گنجائش نہیں ہے۔ میرا دل دجان آپ کی نظر ہے۔ میرے وہ خزانے ہیں جو کبھی خالی نہ ہوں گے۔ آپ کو میں شہرت کے معراج پر پہنچا دوں گی۔ میری آغوش میں آکر دل بے قرار کو تسکین دیجیے۔

نازنین کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ نشہ شوق سے سرشار وہ آغوش کھولے ہوئے میری طرف بڑھی۔ مگر جس طرح تنکا شعلہ ددر بھاگتا ہے۔ اُسی طرح میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس گرمی محبت سے مجھے ایک وحشت سی ہو گئی۔ دل پر ایک موہوم دہشت کا غلبہ ہوا، میں گھبرا گیا۔

حسین ٹھٹھک گئی جس طرح شکار کے چھن جانے سے شیرنی برہم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہتری نگاہوں سے دیکھ کر بولی، ”یہ گریز کیوں؟“

میری زبان سے اضطرابی طور پر نکلا۔ ”میں آپ کا جان نثار خادم ہوں۔ اس اعزاز کے قابل نہیں۔“

حسین نے غضب ناک ہو کر کہا، ”آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں؟“

میں نے مودبانہ انداز سے جواب دیا۔ ”اس کا کبھی خواب میں بھی گمان نہ کیجیے۔ آپ شمع ہیں، میں پردانہ ہوں۔ میرے لیے اتنا ہی اعزاز کافی ہے۔ آپ ذرہ نوازی فرمانا چاہتی ہیں۔ تو سوچنے کا موقع دیجیے۔“

جینہ غصہ مایوس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اور بولی، آپ سچ بچے ظالم اور بے رحم ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہ سمجھتی تھی۔

میں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب اپنے کمرہ میں آکر دل میں اس واقعہ کو تولنے لگا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں ان گن کند میں گرتے گرتے بجا کوئی نیبی قوت میری معاون ہو گئی۔ یہ غیبی قوت کیا تھی؟ میرا اخلاقی احساس جو اتنے عرصہ تک بھول رہنے کے بعد بھی بالکل بے جان پامال نہ ہوا تھا۔ میں اس کی صورت پر فریفتہ تھا۔ لیکن اس کی فتنہ بازیوں اور اس بے فریبیوں سے نفرت کرتا تھا۔ جسم اس کی طرف خود بخود کھینچتا تھا۔ مگر روح دور بھاگتی تھی۔

(۵)

جس کمرہ میں میں مقیم تھا۔ اس کے سامنے جمیل کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا شکستہ حال جھونپڑا تھا۔ اس میں ایک خمیدہ کمر مگر نورانی صورت بے پردہ ہا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اس محل میں آیا کرتے تھے۔ نازنین معلوم نہیں کیوں ان سے نفرت کرتی تھی۔ شاید دل میں ان سے خائف تھی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنی بار ثروت ہو کر بھی وہ ایک فستہ حال بڑھے سے کیوں ڈرتی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی نازنین کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ اپنے کمرہ میں جا کر چھپ جایا کرتی تھی۔ دو چار مرتبہ اس نے مجھ سے بھی اشارۃً بے پردہ کا ذکر کیا تھا۔ لیکن بہت حقارت کے ساتھ۔



رات کو مجھے دیر تک نیند نہیں آیا۔ ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ کبھی جی چاہتا۔ کہ آؤ۔ آنکھ بند کر کے بہارِ حُسن لوٹیں۔ دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھائیں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ ایسے زیریں مواقع کہاں سے نصیب ہوتے ہیں۔ پھر خود بخود طبیعت کھینچ جاتی۔ اور ہمام سا ہوتا کہ اس طلسم میں قدم نہ رکھنا ورنہ تازیست نہ نکل سکو گے۔

رات کے دس بجے ہوں گے کہ دفعتاً میرے کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اور وہی پیر مرد اندر داخل ہوئے۔ حالانکہ میں اپنی مالکہ کی ناراضگی کے خوف سے کبھی ان سے ہم کلام نہ ہوا تھا۔ لیکن ان کے روئے مبارک پر تقدس کی ایسی شان تھی کہ خواہ مخواہ ان کے فیضِ سمیت کا اشتیاق ہوتا تھا۔ میں نے تعظیم کی اور لا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ انہوں نے میری طرف ترحم کی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا۔ میرا محل سونا ناگوار تو نہیں ہے۔

میں نے سر جھکا کر جواب دیا "جناب کی تشریف آوری میں عین اعزاز کا باعث ہے۔"

پیر مرد بولے۔ اچھا تو سنو اور ہو شیار ہو جاؤ۔ تمہارے اوپر ایک بلائے عظیم آنے والی ہے۔ تمہارے لیے اس وقت سب سے بہتر تدبیر یہی ہے۔ کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تازیست کفِ افروس ملے رہو گے۔ میرا جھوپڑا تمہارے سامنے تھا۔ مگر تم نے کبھی مجھ سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ کاش تم پہلے دن مجھ سے ملے تو ہزاروں خاندانوں کو تباہ کرنے والا عذاب تمہارے سر پر نہ ہوتا۔ تعجب تو یہ ہے، کہ تم ایسے بیدار مغز ہو کر اس دام میں کیوں کر آپھنسے؟ اور اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ چھنس کر تم کیوں کر نکل سکے۔ اگر حسینہ ایک بار تمہیں اپنے آغوشِ محبت میں لے لیتی۔

تو پھر تمہارے لیے کوئی امید نہ تھی۔ تم اسی وقت اس کے عجائب خانہ میں داخل کر دیئے جاتے۔ وہ جس پر رکھتی ہے۔ اس کی یہی گت بناتی ہے۔ یہی اس کی محبت ہے۔ چلو ذرا اس عجائب خانہ کی سیر کرو تب تم سمجھو گے کہ تمہارے باموقع گریز نے تمہیں کس آفت سے بچا لیا۔

یہ کہہ کر پیر مرد نے دیوار میں ایک بٹن دبایا۔ فوراً ایک دروازہ نمودار ہوا۔ وہ نیچے جاتے کا زینہ تھا۔ پیر مرد داخل ہوئے اور مجھے بھی بلایا۔ تاریکی میں کئی زینے اترنے کے بعد ایک وسیع کمرہ نظر آیا۔ اسی میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہاں میں نے جو نصرت انگیز و دلخراش نظارے دیکھے۔ انہیں یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اطالیہ کے زندہ جاوید ڈنٹنی نے دوزخ کا جو سبب دکھایا ہے۔ اس سے کہیں ہولناک۔ کہیں پرستگراہ سین میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جا بجا نجاست اور غلاطت میں لپٹے ہوئے آدمی زمین پر بڑے موٹے تھے۔ ان کے اعضاء انسانی تھے لیکن صورتیں مسخ ہو گئی تھیں۔ کوئی کتے سے مشابہ تھا۔ کوئی کیدڑ سے۔ کوئی بنی بلاؤ سے ملتا تھا۔ کوئی سانپ سے۔ ایک گوشہ میں کوئی موٹا تازہ آدمی ایک نحیف و خستہ آدمی کے جگر میں منہ لگائے اس کا خون چوس رہا تھا۔ ایک طرف دو گدھ کی صورت والے انسان ایک کرم خوردہ لاش پر بیٹھے۔ پنجہ و منقار سے ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے۔ ایک

جگہ ایک اثر دہے کی صورت والا آدمی ایک بچے کو نکلنا چاہتا تھا۔  
 پر حلق میں کافی گنجائش نہ ہونے کے باعث عقیاب ہو کر زمین پر ٹوٹتا  
 تھا اور چیختا تھا۔ ایک جگہ میں نے خون کو منجمد کرنے والا نظارہ دیکھا۔  
 دو ناگن کی شکل کی عورتیں ایک بھڑیے کی صورت والے انسان کے  
 گلے میں لپیٹی ہوئی اُسے کاٹ رہی تھیں۔ اس کے بدن سے خون کے  
 فوارے جاری تھے۔ مجھ سے اب اور نہ دیکھا گیا۔ فوراً وہاں سے  
 بھاگا اور گرتا پڑتا اپنے کمرہ میں آ پہنچا۔ پیر مرد بھی میرے ساتھ چلے  
 آئے۔ جب میرے ہوش ذرا بجا ہوئے تو انہوں نے کہا۔ تم اتنے جلد  
 گھبرا گئے۔ ابھی تو ایک گوشہ بھی نہیں دیکھا۔ یہ تمہاری مالکہ کی سگڑ  
 ہے۔ یہ ان کے پالتو جانور ہیں۔ ان کی حرکات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی  
 ہیں۔ انہوں نے اس عجائب خانہ میں جن جن کر آدمی رکھے ہیں۔ تمہیں  
 بھی اسی لیے منتخب کیا تھا۔ معلوم نہیں کیا بنانا چاہتی ہیں۔ وہ نیت  
 نئے جال بناتی رہتی ہے۔ اب کے کسی تعلیم یافتہ آدمی کو بھانسا چاہتی  
 تھی۔ اسی لیے پرائیویٹ سیکرٹری کا اشتہار دے رکھا تھا۔ اب  
 میری یہی صلاح ہے کہ اسی وقت یہاں سے بھاگو ورنہ حبس کے  
 دوسرے وار سے نہ بچ سکو گے۔

یہ کہہ کر پیر مرد غائب ہو گئے۔ میں نے ابھی اپنا بقیہ سنبھالا اور  
 ادھی رات کے سائے میں چوروں کی طرح کمرہ سے باہر نکلا۔ فرحت  
 بخش ہوائیں چل رہی تھیں۔ سامنے پھیل میں تارے تھرک رہے تھے

جنا کی خوشبو سے ہوا معطر تھی اور جھیل کے اس پار پیر مرد کی شکستہ  
 بھونپڑی میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں نے سیدھا راستہ  
 چھوڑ دیا اور جھیل کے کنارے کنارے کیپڑ میں پھنسا سڑک تک آپہنچا  
 کس شان سے آیا تھا کس سہیت کدائی سے جا رہا تھا؟ لیکن دل میں  
 ایسا خوش تھا جیسے کوئی چڑیا بچہ باز سے جھوٹ جائے۔

گو میں ایک جہینہ کے بعد لوٹا تھا۔ پر معلوم نہیں۔ کیوں نہ ابھی  
 تک گھر کے آدمیوں کو اور نہ احباب کو میری فکر تھی۔ کمرہ میں ذرا  
 بھی گرد و غبار نہ تھا۔ میں نے جب اپنے گھر پر اس واقعہ کا ذکر کیا تو  
 لوگ خوب ہنسے اور احباب تو ابھی تک مسخر کیا کرتے ہیں۔ کہیں  
 ایک لمحہ کے لیے بھی کمرہ سے باہر نہیں نکلا۔ ایک جہینہ غائب رہنے  
 کا ذکر ہی کیا؟ اس وجہ سے اب مجھے بھی مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ شاید  
 میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ بہر حال جو کچھ ہوا میں خدا کا ہمارا شکر  
 کرتا ہوں کہ میں اس آزمائش سے بچ کر نکل آیا۔ مگر اس کے ساتھ مجھے  
 اس آزمائش میں پڑنے کا افسوس نہیں ہے کیونکہ اس نے ہمیشہ کے لیے  
 میری آنکھیں کھول دیں۔

## دھوکا

ستی گنڈ میں کھلے ہوئے کنول بسنت کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ صبح کی سکون بخش سنہری کرنیں ان سے گلے مل کر مسکراتی تھیں جس کے پھول ونا کے نہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

راجکمار ہی پر بھاگنڈ کے کنارے ہری ہری گھاس پر کھڑی خوشنوا چڑیوں کے نغمے سن رہی تھی۔ اس کا کندنی رنگ انہیں پھولوں کی طرح دمک رہا تھا۔ صباوت کی ایک تصویر تھی۔ جو آفتاب کی زردیں شعاعوں سے بنائی گئی تھی۔ پر بھانے موٹسری کے درخت پر بیٹھی ہوئی ایک شیا ما کی طرف دیکھ کر کہا۔

میراجی چاہتا ہے کہ میں بھی ایسی ہی چڑیا ہوتی۔  
اس کی ہیلی ایتنا نے مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ کون؟“

پر بھانے کند کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا۔ ”پٹر کی ہری بھری ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی چھپاتی۔ میری شیریں نوائیوں سے سارا باغ گونج اٹھتا۔“  
امبنا نے چھپر کر کہا۔ نوگرھ کی رانی ایسی کتنی ہی چڑیوں کا گانا جب چاہے سن سکتی ہے۔

پر بھانے سے سر جھکا کر بولی۔ مجھے نوگرھ کی رانی بننے کی آرزو نہیں ہے میرے لیے کسی ندی کا سنسان کنارہ چاہیئے۔ ایک بہن، اور دوسرے خوشنوا پرندوں کی صحبت نعمت شیریں میں میرے لیے ساری دنیا کی نعمتیں بھری ہوئی ہیں۔  
پر بھانے شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ اور اکثر ایسے پسند دیکھا کرتی تھی۔ امبنا کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ اتنے میں باہر سے کسی کے گانے کی آواز آئی۔  
کر گئے تھوڑے دن کی پریت

پر بھانے ہم تن گوش ہو کر سنا۔ اور بیقرار ہو کر بولی، بہن اس آواز میں جادو ہے۔ مجھ سے اب بغیر سنے نہیں رہا جاتا۔ اسے اندر بلا دو۔  
امبنا پر بھی نعمت کا جادو اثر کر رہا تھا۔ بولی آج تک بے شک ایسا راگ میں نے نہیں سنا۔ کھڑکی کھول کر بلا لاتی ہوں۔

تھوڑی دیر میں راگیا اندر داخل ہوا۔ شکیل خوش قامت نوجوان تھا۔ برہنہ برہنہ سر کندھے پر ایک مرگ چھالا تھا۔ بدن پر گہرے رنگ کی کفن، اور ہاتھوں میں ایک ستارہ، چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ اس نے دبی ہوئی نگاہوں سے دونوں حسینوں کو دیکھا۔ اور تب سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

پر بھانے بھی جھکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اور نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

امبانے کہا، جو گی جی! ہمارے بڑے بھاگ تھے کہ آپ کے درشن ہوئے۔  
ہم کو بھی کوئی پد سنا کر تار تھ کیجیے۔ جو گی نے سر جھکا کر جواب دیا، ”ہم جو گی لوگ زان  
کا بھیج کر تے ہیں۔ ایسے ایسے درباروں میں ہم کیا گاسکتے ہیں۔ پر آپ کی مرجی ہے  
تو سنئے۔“

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

کہاں وہ پریت، کہاں وہ پچھڑون، کہاں دھوین کی ریت

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

جو گی کی رسیلی اور پُر درد آواز، ستارہ کی زمزمہ سنجیاں، اس پر نغمہ کی لطافت  
پر بھاکو بخود کیے دیتی تھیں۔ اس نے بڑی درد رس طبیعت پائی تھی۔ اور اس کا  
ذوقِ نغمہ نہایت لطیف تھا، جس طرح ستارہ کے زمزمے ہوا میں گونج رہے تھے، اسی  
طرح پر بھاکے دل میں شیریں تصورات کی ترنگیں اٹھ رہی تھیں۔ سوتے ہوئے  
جذبات کی نیلیں ٹوٹ گئیں۔ دل سر زمینِ خواب میں جا پہنچا۔ سننی کنڈ کے کنولِ طلسم  
کی پریاں بن بن کر منڈلاتے ہوئے بھونروں سے دست بستہ اور با چشم پر آب  
بستی تھی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

سُرخ اور بنر پتیوں سے لدی ڈالیاں، حجاب سے سر جھکائے چپکتی ہوئی  
پٹلیوں سے رو رو کتی تھیں۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

اور راجکری پر بھاکا دل بھی ستارہ کی ستارہ اداؤں کے ساتھ گونجتا تھا۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

————— (۲) —————

بر بھابھ گولی کے راؤ دیوی چند کی اگوتی بیٹی تھی۔ راؤ صاحب پرانے وقتوں کے رئیس تھے۔ کرشن کی اپانائیں غرق رہتے جس کا ایک خاص جزو سماج ہے اس لیے ان کے دربار میں دور دور سے کلاومت اور گویے آیا کرتے۔ اور انعام و اکرام پاتے۔ راؤ صاحب کو نغمہ سے عشق تھا خود بھی اس فن کے استاد کامل تھے۔ اگرچہ اب پیرانہ سالی کے باعث کاوش کی طاقت باقی نہ تھی۔ پر اس فن کے رموز و نکات کے ماہر تھے۔ پر بھابھ اپنے ہی سے ان ہجستوں میں بیٹھنے لگی۔ اور کچھ طبعی مناسبت اور کچھ شب و روز کے چرچوں کے طفیل اسے بھی اس فن میں درخور ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے حسن کا شہرہ تھا۔ راؤ صاحب نے نوگرہ کے جوان بخت اور نیک ہنادراجہ ہری چند سے اس کی شادی تجویز کی تھی۔ طرفین سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ ہری چند مو کا لچ اجیر کے معلم تھے۔ اور نئی تہذیب کے دلدادہ، ان کی استدعا تھی کہ انہیں ایک بار راجکمار پر بھابھ سے بالمشافہ ہمکلام ہونے کا موقع دیا جائے۔ پر راؤ صاحب اس گناہِ عظیم کے مرتکب نہ ہو سکتے تھے۔

پر بھابھ راجہ ہری چند کے نئے خیالات کے چرچے ہی اس تعلق سے بہت مطمئن نہ تھی۔ پر جس وقت اس نے اس باکمال اور نو جوان جوگی کا گنا سنا تھا۔ اس وقت سے وہ اسی کے دھیان میں ڈوبی رہتی۔ ابنا اس کی سہیلی تھی۔ ان کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔ پر اس راز کو پر بھابھ نے اس سے بھی پوشیدہ رکھا۔



امیبا اس کی مزاج شناس تھی۔ معائنہ لگئی۔ پراس نے پند و نصیحت کر کے اس  
 آگ کو بھڑکانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے خیال کیا کہ کس پیر سی کی حالت میں یہ دم  
 چند دنوں میں کا نور ہو جائے گا۔ جیسا کہ اکثر سودائے خام کا انجام ہوتا ہے۔ مگر اس کا  
 قیاس غلط ثابت ہوا۔ جوگی کی صورت کبھی پر بھائی آنکھوں سے نہ ترقی اسکا مدھر  
 راگ ہر دم اس کے کانوں میں گونجا کرتا۔ اسی کندھے کنارے وہ از خود رنگی کے  
 عالم میں سارا دنیا بیٹھی رہتی۔ اور عالم خیال میں وہی مدھر، دلکش راگ سنتی اور  
 وہی نورانی۔ نتیجتاً کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ باہر سے وہ آواز آرہی  
 ہے۔ وہ چونک پڑتی اور وحشت کے عالم میں باغ کی چار دیواری تک جاتی۔ وہاں  
 سے مایوس ہو کر لوٹ آئی اور اپنے تئیں سمجھاتی۔ یہ کیسی حالت ہے؟ مجھے  
 کیا ہو گیا ہے؟ میں ہندو لڑکی ہوں۔ والدین سے جسے سوچ دیں۔ اس کی  
 لونڈی بن کر رہنا میرا دھرم ہے۔ مجھے دل و جان سے اس کی خدمت کرنی چاہیے۔  
 کسی دوسرے کا خیال بھی دل میں لانا میرے لیے پاپ ہے۔ آہ! دل میں پریم کا خیال  
 رکھ کر میں کس منہ سے اپنے شہر کے پاس جاؤں گی۔ ان کانوں سے سے کیونکر وہ محبت  
 کی باتیں سنوں گی جو میرے لیے طعنے سے بھی زیادہ تلخ ہوں گی؟ ان آنکھوں سے  
 کیسے وہ محبت کی نگاہیں دیکھوں گی جو نگاہِ قہر سے بھی زیادہ دھوڑ ہوں گی؟ اس گرنی  
 میں وہ محبت کے ہاتھ پڑیں گے جو زنجیر سے بھی زیادہ گراں بار ہوں گے۔ پیارے!  
 تم میرے دل سے نکل جاؤ۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ میرا بس ہوتا تو تمہیں دل کی  
 سیج پر سلاتی۔ مگر میں دھرم کی رسیوں میں بندھی ہوئی ہوں۔  
 اس طرح ایک ہینہ گزر گیا۔ بیاہ کے دن نزدیک آتے جاتے تھے اور پر بھاکا

کنول سا چہرہ مرجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ان حسرت ناک خیالوں سے بے چین ہو کر اس کا جی چاہتا کہ کنڈکی گود میں پناہ لوں۔ لیکن راؤ صاحب پر اس حد تک بھانسا کہ اسے اثر کا خیال کر کے رُک جاتی۔ اور سوچتی میں ان کا سرمایہ زندگی کافی ہوں۔ مجھ پر نصیب کو انہوں نے کس ناز و نعمت سے پالا ہے۔ میں ہی ان کی زندگی کا سپہاڑا، امداد ان کی آخرت کی امید ہوں۔ نہیں یوں خیال دے کر میں ان کی آرزوؤں کا خون نہ کرؤں گی۔ میرے دل پر جو چاہے گزے، انہیں نہ کڑھاؤں گی۔

بظاہر پر بھاکا ایک گوبے جوگی کے پیچھے دیوانہ ہو جانا مسکری معلوم ہوتی ہے اس کے نغے تان سین کی تانوں سے بھی زیادہ دلربا کیوں نہ ہوں۔ پر ایک راہگماری کے لیے اس کے ہاتھوں یک جانا حد درجہ کی کمزوری کہی جاسکتی ہے۔ لیکن راؤ صاحب کے دربار میں ظلم کا، شجاعت کا، مردانہ جان تارائیوں کا کوئی پیر چاند تھا۔ جن سے حسن کی کلیاں کھلتی ہیں۔ وہاں تو شب و روز زمرہ سنجیوں کے دور رہتے تھے۔ اس فنا کے ماہر اعزاز کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ اور انہیں پر تحسین کے بہترین جواہر ٹٹے جاتے تھے۔ وہاں گانا ہی مکمل کا معیار تھا۔ پر بھانے والی نیسے ہی سمجھتی دیکھی تھیں۔ اور اس پر ان کا کاٹھ ہار تنگ چڑھ گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی طبیعت نے جو روش اختیار کی۔ اس پر تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

— (۷) —

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ راؤ صاحب نے پر بھاکا کو گلے سے لگالیا اور رورور کر رخصت کیا۔ پر بھاکا بھی بہت روئی۔ امیکا کو تو وہ کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔

لوگڑھ بڑی ریاست تھی اور راجہ ہری چند کی خوش انتظامی کے باعث رونق پر تھی۔ پر بھاکا کی خدمت کے لیے لونڈیوں کی ایک فوج تھی۔ اس کے لیے آئند بھون سبایا گیا تھا۔ جسے قدرت نے فساد دی تھی، اور صنعت نے فرحت، مشاطہ نے دلہن کو خوب سنوارا۔ راجہ صاحب شوق دیدار سے بے چین تھے۔ اندر گئے۔ پر بھانے ہاتھ جوڑے ہوئے سر جھکا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ مگر آنکھوں سے آنسو کی ندی بہہ رہی تھی۔ دلہانے عاشقانہ جوش سے گھونگھٹ ہٹا دیا جن کا چراغ تھا، پر بے نور۔

دوسرے دن سے راجہ صاحب کی یہ کیفیت ہوئی کہ بھونے کی طرح ہر دم اس پھول پر منڈ لایا کرتے۔ نہ امور ملکی کی فکر تھی۔ نہ سیر و شکار کی پردا۔ پر بھاکا کی باتیں نغمہ تھیں۔ اس کی لگا ہین سانس، اور اس کے دیدار میں سیر کہسار کی دلدادیزی تھی۔ محبت کے نشے میں بے خود ہوئے جاتے تھے۔ وہ کیا جانتے تھے، کہ دزدہ میں لکھی ہے۔

یہ غیر ممکن تھا کہ راجہ صاحب کی ان دلجوئیوں اور نانہ برداریوں کا پر بھاکا پر کوئی اثر نہ ہوتا اور ان سے اظہار ثروت مقصود نہ تھا۔ اس میں سچا انوراک بھرا ہوا تھا۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے۔ اس سے ہم نفرت نہیں کر سکتے۔ پر بھاول میں نام ہوتی وہ اپنے کو ایسی کامل خالص، محبت کے قابل نہ پاتی تھی۔ اس خلوص کے عوض میں اسے اپنے مصنوعی رنگے ہوئے جذبات ظاہر کرتے ہوئے روحانی صدمہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ راجہ صاحب اس کے ساتھ رہتے، وہ انہیں اپنی شیریں ادائیگوں میں غمور رکھتی۔ وہ ان کی گردن میں لٹا کی طرح لپٹی ہوئی گھنٹوں پریم کی باتیں کیا کرتی۔ وہ ان کے ساتھ گلشن کی کیا ریون میں چلبلیں کرتی۔ ان کے لیے پھولوں کے مار گوندھتی۔ اور ان کے گلے میں ڈال کر کہتی، پیارے! دیکھنا یہ پھول مرجھا نہ جائیں۔ انہیں ہمیشہ

تازہ رکھنا۔ وہ چاندنی راتوں میں ان کے ساتھ کشتی پر بیٹھ کر پھیل کی سیر کرتی۔ اور انہیں پریم کے رائے سناتی۔ اگر انہیں باہر سے آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ پر مزہ شکوے کیا کرتی۔ اور انہیں بے رحم اور بے دردی کہتی۔ ان کے سامنے خود ہنستی آنکھیں ہنستیں، اور آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا۔ مگر آہ ایجب وہ اکیلی ہوتی تو طائر خیال اڑ کر اسی کنڈ کے کنارے جا پہنچتا۔ کنڈ کا وہ نیلگوں پانی اس پر تیرتے ہوئے کنول اور مولسروں کی قطاریں آنکھوں کے سامنے آ جاتیں پھر امبا مسکراتی، نزاکت سے لپکتی آ جاتی۔ اور تب ریلے جوگی کی دلفریب مستانہ تصویر آنکھوں میں آ بیٹھی۔ اور ستار کے نشہ خیز زم زموں کے ساتھ نغمہ جاں گداز کی صدائیں آنے لگتیں۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت  
تب وہ ایک سرد آہ کھینچ کر اٹھ بیٹھی اور باہر نکل کر پنجرے میں چپکتی ہوئی  
جریلوں کی شیریں نوائیوں میں پناہ لیتی۔ اس طرح یہ خواب پریشان ہو جاتا۔

— (۴۱) —

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک روز راجہ ہری چند پر بھا کو اپنے نگار خانہ میں لے گئے جو استادان فن کی سحر طرازیوں کا بے نظیر مجموعہ تھا۔ طاق اول میں تاریخی تصاویر تھیں۔ داخل ہوتے ہی رانا پر تاپ کی قد آدم تصویر نظر آئی جس کے چہرہ سے مردانہ سطوت کی شغائیں نکل رہی تھیں۔ ذرا آگے بڑھ کر دائیں طرف سرفروش سانگا، جانباز جمیل اور دلیر درگاہ اس جلوہ افروز تھے بائیں طرف فیوراجیت اور شیر دل بھیم سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رانا پر تاپ کے مقابل سلیم،

لقد ثابت قدم سیوا جی کی تصویر تھی۔ طاق کے بالائی حصہ میں آئینے سامنے کاہل  
کرشن اور روشن عنبر نلام برابر جتے تھے۔ مصوروں نے چہرہ نگاری میں کمال دکھایا  
تھا۔ باطن کو ظاہر بنا دیا تھا۔ پر بھانے پر تاپ کے پیروں کو چوما اور کرشن کے سامنے  
دیر تک آنکھوں میں احترام اور پریم کے آئینہ بھرے سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کے  
دل پر اس وقت ایک تقدس آمیز زعب طاری تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ یہ ان  
بزرگوں کی تصویریں نہیں۔ بلکہ ان کی پاک رو میں ہیں جن کے کارناموں سے ہندوستان  
کی تاریخ روشن ہے۔ جو ہندوستان کا بہترین قومی سرمایہ، اعلیٰ ترین قومی یادگار  
اور بلند ترین قومی نعرے ہیں۔ وہ ان کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی۔ اور جلدی سے طاق  
کے دوسرے حصہ میں داخل ہو گئی یہاں وسط میں نورانی بڑھدیوگ آسن میں بیٹھے  
ہوئے نظر آئے۔ ان کے دائیں طرف عارف شکر تھے اور بائیں طرف بیدار مغر دیانند  
ایک حصہ میں درویش کبیر اور صاحب دل رام داس پہلو پہلو کھڑے تھے۔ ایک دیوار  
پر عالی مقام گوند اپنے شہادت کے دونوں تاروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔  
دوسری دیوار پر ہندو فلسفہ کی بزم جادو قائم تھی۔ مصوروں کا کمال ایک ایک عضو  
سے ٹپکتا تھا۔ پر بھانے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ پر ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکی۔  
اسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ ان کی منور آنکھیں اس کے دل پر داغ میں چھپی جاتی ہیں۔  
اس کے بعد طاق کا تیسرا درجہ آیا۔ شعرا نازک خیال کی مجلس آراستہ تھی۔ روشن  
خیال دامیک اور ہمگیر ویاس جلئے۔ حد پر رزوقی افروز تھے۔ داہنے طرف رنگین  
بیان کالی داس تھے۔ بائیں طرف جدت طراز بھوبتی۔ قریب ہی بھرتی اپنے گوشہ  
قناعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جانب راست معنی آفرین غالب اور انسانی فطرت

کے رز شناس انیس تھے۔ جانب چپٹے پر سطوت ذوق، اور شیریں کلام آتش پُر  
گوئی پر زمانہ شناس حالی، لطیف اکبر اور رفیق اقبال نے اس دائرہ کو پورا کر  
دیا تھا۔

دائیں طرف کی دیوار پر ہندی شعرا کا مجمع تھا۔ صوفی سور فطرت نگار تلسی،  
قادر الکلام کیشو، اور عاشق تن بہاری، درجہ بدرجہ جلوہ افروز تھے۔ سور داس سے  
پر بھاکر دھانی عقیدت تھی۔ اس نے قریب جا کر ان کے قدموں کو بوسہ دینا چاہا۔  
دفعتاً انہیں قدموں کے سامنے سر جھکائے اسے ایک چھوٹی سی تصویر نظر آئی۔ پر بھاکر  
اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ یہ وہی تصویر تھی جو اس کے پردہ دل پر کھینچی ہوئی تھی۔  
وہ دوبار اس کی طرف نگاہ نہ کر سکی۔ دبی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

راجہ ہری چند نے مسکرا کر پوچھا۔ اس شخص کو کہیں تم نے دیکھا ہے؟

اس سوال سے پر بھاکر کا دل کانپ اٹھا۔ جیسے ہرن شکاری کے سامنے راہ فرار  
نہ پناہ گھرا یا ہوا۔ ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ اسی طرح پر بھاکر دیوار کی طرف تانے لگی پہچنے  
لگی کیا جواب دوں؟ اس کو کہاں دیکھا ہے؟ انہوں نے یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھا، کہیں  
تاڑ تو نہیں گئے؟ یا نارائن میری پت تہارے ہاتھ ہے۔ کیونکر انکار کروں؟ چہرہ زرد  
ہو گیا۔ سر جھکا کر دبی ہوئی زبان سے بولی۔ ہاں خیال آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے؟

ہری چند، کہاں دیکھا؟

پر بھاکر کے سر پر جھکے سا آنے لگا۔ بولی شاید ایک بار وہ گاتا ہوا میرے باغ کے  
سامنے سے جا رہا تھا۔ ابنا نے بلا کر اس کا گانا سنا تھا۔

ہری چند نے پوچھا، کیسا گانا تھا؟

پربھاکے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سوچتی تھی۔ راجہ کا ایسی باتیں پوچھنا معنی سے خالی نہیں۔ دیکھوں آج لانج رہتی ہے۔ یا نہیں، بولی اس کا گانا تو ایسا برا نہ تھا۔

ہری چند نے شرارت آمیز انداز سے مسکرا کر پھر پوچھا، کیا گایا تھا؟

پربھاکے اس سوال پر باخبر ہو گئی۔ سوچی اس سوال کا سچا جواب دے دوں۔ تو پھر باقی کیا رہتا ہے۔ یقین ہو گیا۔ کہ آج خیریت نہیں ہے۔ چھت کی طرف دیکھ کر بولی، سورس کا کوئی پڑ تھا۔

ہری چند نے کہا۔ ”یہ تو نہیں۔“

کر گئے ننھوٹے دن کی پریت

پربھاکے آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سرتیور نے لگا بھڑی زہرہ سکی بیٹھ گئی اور مایوسانہ انداز سے بولی، ناں یہی پڑ تھا۔ اور فوراً ہی کلیجہ مضبوط کر کے پوچھا، آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ ہری چند بولے، وہ میرے یہاں اکثر آیا جایا کرتا ہے۔ مجھے بھی اس کا گانا بلند ہے اسی نے مجھ سے یہ حال بتایا تھا۔ مگر وہ تو کہتا تھا۔ کہ راجہ کماری نے میرے گانے کو بہت پسند کیا اور پھر آنے کے لیے اصرار کیا۔

پربھاکو اب سچا نصفہ دکھانے کا موقع ملا۔ تیز ہو کر بولی، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

ہری چند بولے ”وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ کہ یہ حضرت کی چالاکی ہے۔ ڈینگ مارنا گوتوں کا خاصہ ہے۔ مگر اس میں تو تمہیں انکار نہیں۔ کہ اس کا گانا برا نہ تھا۔“ پربھاکے خفیف ہو کر بولی۔ نہ! اچھی چیز کو برا کون کہے گا۔

ہری چند نے پوچھا، پھر سننا چاہو تو اسے بلواؤں۔ سر کے بل دوڑا اُٹے گا۔

کیا ان کے درشن پھر ہوں گے؟ امید ہے اس کا چہرہ شکفتہ ہو گیا۔ مگر ان کئی ہفتوں کی متواتر کوشش سے جس خیال کو فراموش کرنے میں وہ کسی قدر کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کے پھر تازہ ہو جانے کا خوف دامنگیر ہوا بولی، میرا اس وقت گانا سننے کو جی نہیں چاہتا۔ ہری چند نے اصرار کیا۔ ”یہ میں نہ مانوں گا، تم ارد گرد گانا سننا نہ چاہو۔ میں ابھی اُسے بلائے لاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر راجہ ہری چند تیر کی طرح طاق سے باہر نکل آئے۔ پر بھکا اینٹیں روک نہ سکی۔ وہ دم بخود فکر میں ڈوبی کھڑی تھی۔ دل میں خوشی اور رنج کی لہریں باری باری سے اٹھتی تھیں۔ مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے۔ اسی ستار کی مستانہ صداؤں کے ساتھ جوگی کی ریلی تان سنائی دی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

وہی دل آویز نغمہ تھا، وہی جذباتی تاثیر، وہی روحانی دلکشی وہی سب کچھ جو فکر اور تخیل اور جذبات کو مسخر کرتا تھا۔

ایک لمحہ میں جوگی کی موسیقی صورت دکھائی دی۔ وہی مستانہ پن، وہی نشیبی آنکھیں، وہی دیوتاؤں کی سی صورت، اس کے چہرہ پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ پر بھکا نے اس کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ دفعتاً اس کا کلیجہ اچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ بے خودی کے نشہ سے اُٹھی ہوئی آنکھوں میں پریم کے آنسو بھرے۔ وہ اپنے شوق کے پیروں پر گر پڑی اور بولی ”پریم“

راجہ ہری چند کو آج گرمی محبت، خلوص جذب، اور تسلیم کامل کا ایک نیا دلولہ انگیز اور سرد و فراخ تجربہ ہوا۔ وہ ناقابل اظہار کسی جو عالم خلوص میں بھی



کھٹکا کرتی تھی، دودھ ہو گئی تھی۔ انہوں نے پر بھکا کو سینے سے لگا لیا۔ آج ان دونوں  
دلوں کے درمیان کوئی میل، کوئی حد، فاصلہ، کوئی آڑ نہیں ہے۔ آج ان میں سچا  
ملاپ ہوا ہے۔

راجہ ہری چند نے کہا، ”جانتی ہو میں نے یہ سو آنگ کیوں رچا بھکا؟ گانے  
کا مجھے ہمیشہ سے شوق ہے اور سنا کہ تہیں بھی اس کا جنون ہے۔ بہتیں اپنا دلِ نظر  
کرنے سے پہلے ایک بار تمہارا درشن کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اور اس کے لیے سب  
سے بہتر ترکیب یہی نظر آئی۔“

پر بھکا نے سرشار آنکھوں سے دیکھ کر کہا، ”جو گی بن کر تم نے جو کچھ کیا پالیا۔  
وہ راجہ رہ کر تم ہرگز نہ پاسکے۔ تم میرے بیتی رہتے پر تم نہ ہو سکتے۔ اب تم میرے  
بیتی بھی ہو، اور پر تم بھی۔ مگر تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اور میری آتما کو کنہہ گار  
بنایا، اس کا ذمہ دار کون ہو گا؟“



## سوت

پنڈت دیودت کی شادی ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی، جب تک ان کے ماں باپ زندہ تھے۔ وہ ان سے ہمیشہ دوسری شادی کرنے کے لیے تقاضا اور اصرار کرتے رہے۔ مگر پنڈت جی کبھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انہیں اپنی بیوی گوداوری سے سچی محبت تھی۔ اور اولاد کی آرزو میں وہ اپنی موجودہ عاقبت۔ اور اطمینان کو خیر باد نہیں کہنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نئے خیالات کے آدمی تھے۔ اور ان ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ جو اولاد اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جب تک انسان میں اتنی قدرت نہ ہو کہ وہ اپنی اولاد کی کما حقہ پرورش، تعلیم اور تربیت کا فیصلہ ہو سکے۔ اسے شادی سے محترز رہنا چاہیے۔ اسے وہ خوب سمجھتے تھے پہلے پہلے تو کبھی کبھی بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر ان کے جگر پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔

مگر اب اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح وہ بھی جسمانی عوارض میں مبتلا رہتے تھے۔ اور اولاد کا خیال کرتے ہی انہیں ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گوداوری اتنی جلدی مایوس ہونے والی نہ تھی۔ پہلے تو وہ دیوی، دیوتا، گندے تعویذ اور جنتر منتر پر معتقد رہی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تو اس نے پنڈت جی کی دوسری شادی کرنے کا منصوبہ کیا۔ اس نے ہفتوں ہینڈل اس فکر میں کاٹے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ مگر جو بات من میں ساگئی تھی۔ وہ کسی طرح نہ نکلی۔ ہاں اسے بڑی زبردست قربانی کرنا پڑے گی۔ شاید شوہر کی محبت کا انمول رتن بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ پر کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ چند سال تک لگاتار جس نخل محبت کو پالا۔ اور سینچا۔ کیا وہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہر سکے گا۔

گوداوری نے آخر کار اولاد کی پروردگار خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور موت کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

## ۱ ————— ۲ —————

پنڈت دیودت، گوداوری کی یہ تجویز سنتے ہی ہنس پڑے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ یا تو میری محبت کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ یا میرا من لینے کی کوشش ہے۔ ہنس کر بات ٹال دی۔ مگر جب گوداوری نے متین انداز سے کہا: ”تم اسے ہنسی مت سمجھو۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ اولاد کا منہ دیکھنے کے لیے میں موت سے چھاتی پر مونگ دلوانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ تب تو پنڈت جی کو کوئی شبہ نہ رہا۔ اتنے اعلیٰ اور بے نفس ارادے

سے بھری ہوئی گوداوری کو انہوں نے گلے سے لگالیا اور بولے، ”مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ مجھے اولاد کی آرزو نہیں“ گوداوری نے زور دے کر کہا، ”تم کو نہیں مجھے تو ہے اگر اپنی خاطر سے نہیں تو میری خاطر سے یہ کام کرنا پڑے گا۔“

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے۔ حامی تو نہ بھری مگر کچھ نیم راضی سے ہو گئے۔ بس اس کی دیر تھی۔ پنڈت جی کو ذرا بھی تکلیف نہ کرنا پڑی۔ گوداوری کی والہمنہی نے ساری منزل آسان کر دی۔ اس نے صرف اپنے پاس سے روپے ہی نہیں نکالے بلکہ اپنے گتے پڑے بھی نذر کر دیئے۔ بدنامی کا خوف اس راستہ میں ایک بڑا زبردست کاٹھا تھا۔ دیودت جی میں سوچتے، کہ جب میں سر پر مور سجا کر موچیں کٹوائے۔ ددہا بنا ہوا انگلوں گا۔ تو لوگ بٹھے کیا کہیں گے۔ میرے دفتر کے لوگ مضحکہ اڑائیں گے۔ اور میری طرف مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ان کی یہ نگاہیں چہرے سے بھی زیادہ تیز ہوں گی۔ اس وقت کہاں منہ چھپاؤں گا؟ مگر گوداوری نے اپنے گادوں میں جا کر اس کام کو چھیڑا۔ اور خیریت انجام تک پہنچا دیا۔ نئی ہو گھر میں آگئی۔ اس وقت گوداوری ایسی خوش تھی۔ گویا بیٹے کا بیاہ کر لائی ہے وہ خوب گاتی بجاتی رہی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بہت جلد اس گانے کے بدلے رونا پڑے گا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ گوداوری اپنی سوت پر اسی طرح حکومت کرتی تھی۔ گویا وہ اس کی ساس ہے۔ تاہم اسے یہ بات اک دم کے لیے نہ بھولتی تھی۔ کہ میں اصل میں اس کی ساس نہیں ہوں۔ اُدھر گھومتی کو بھی اپنی حیثیت کا پورا خیال رہتا تھا۔ اسی لیے گوداوری کی حکومت، ساس کی حکومت کی طرح سخت نہ ہونے کے باوجود

اسے ناقابل برداشت معلوم ہوتی۔ اسے اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے بھی گوداوری کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی تھی۔

بکھ دلوں بعد گوداوری کی عادات میں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ وہ پنڈت دیودت کو گھر میں آتے جاتے بڑی تیز پنجس نگاہوں سے دیکھتی۔ اس کی فطری متانت غائب سی ہو گئی۔ ذرا سی بات بھی اس کے پیٹ میں نہیں بکتی جب پنڈت جی دفتر سے آتے ہیں۔ تب گوداوری گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی ہوئی گومتی کا ذکر خیر کیا کرتی ہے۔ اس داستان میں اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ تو پنڈت جی کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ گوداوری کیوں اتنی پرگو ہو گئی تھی۔ اس کا راز سمجھنا مشکل ہے۔ شاید وہ اب گومتی سے ڈرتی تھی۔ ان کے حسن سے، اس کے شباب سے اور اس کی شرمیلی آنکھوں سے، بازھ کر توڑ کر وہ اب پانی کا بہاؤ مٹی کے ڈھیلوں سے روکنا چاہتی ہے۔

ایک دن گوداوری نے گومتی سے میٹھے چاول پکانے کو کہا۔ شاید رکھشا بندھن تھا۔ گومتی نے کہا شکر نہیں ہے۔ گوداوری یہ سن کر متحیر ہو گئی۔ اتنی شکر اتنی جلد کیسے اٹھ گئی۔ جسے چھاتی پھاڑ کر کمانا پڑتا ہے۔ اسے اکھرتا ہے۔ کھانے والے کیا جانیں؟

جب پنڈت جی دفتر سے آئے تو یہ ذرا سی بات ایک طولانی داستان بن کر ان کے کانوں میں پہنچتی۔ تھوڑی دیر کے لیے پنڈت جی کو شبہ ہوا۔ کہ کہیں گومتی کو غلبہ اشتہا کا مرض تو نہیں ہو گیا۔

ایسا ہی واقعہ ایک بار پھر ہوا۔ پنڈت جی کو بوا سیر کی شکایت تھی۔ لال

مرزج بالکل نہ کھاتے تھے۔ گودادری جب کھانا پکاتی تو اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گوشتی نے ایک دن مصالحہ کے ساتھ دال میں تھوڑی سی لال مرزج بھی ڈال دی پنڈت جی نے دال کم کھائی۔ مگر گودادری گوشتی کے پیچھے پڑ گئی۔ اینٹھ کر اس سے بولی۔ ”ایسی زبان جل کیوں نہیں جاتی۔“

————— (۴) —————

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے ہی، دفتر سے آئے، کھانا کھایا، پڑ کر سو رہے۔ وہ ایک ہفتہ دار اخبار منگواتے تھے۔ مگر اسے کبھی کبھی مہینوں کھولنے کی نوبت نہ آتی تھی جس کام میں ذرا بھی تکلیف یا تردد ہو۔ اس سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے دفتر میں تینیسٹر کے پاس مفت ملا کرتے تھے۔ مگر پنڈت جی ان سے کبھی کام نہ لیتے۔ اور ہر لوگ مانگ لے جاتے تھے۔ رام لیلایا اور کوئی میلّا تو شاید نوکری کرنے کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ گودادری ان کی عادت سے واقف ہو گئی تھی۔ پنڈت جی بھی ہر ایک معاملہ میں اسی کی رائے پر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔

پر رونی جیسی ملائم شے بھی دب کر سخت ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی کو یہ آٹھوں پہر کی دیکھ بھال سخت ناگوار معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی وہ من ہی میں جھنجھلانے بھی لگتے۔ قوت امدادی جو سروسہ درازہ تک بے کار پڑے رہنے سے بالکل مردہ ہو گئی تھی۔ از سر نو خود کرنے لگی۔

پنڈت جی یہ مانتے تھے۔ کہ گودادری نے سوت کو گھزلانے میں بڑے ایشار سے کام لیا۔ اس ایشار کو بشریت سے کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن اس کا جوا احسان

ہے، مجھ پر ہے۔ گومتی پر اس کا کیا احسان؟ میرے باعث اس سے کیوں اس بے دردی کا برتاؤ کیا جاتا ہے؟ یہاں اسے ایسا کون سا سکھ مل گیا ہے جس کے بدلے میں وہ یہ پھٹکاریں ہے، شوہر ملا ہے، وہ بوڑھا، دائم المرض گھر ملا ہے۔ وہ ایسا کہ آج نوکری چھوڑ جائے تو کل نان شبیہ کا بھی ٹھکانا نہیں۔ ان حالات میں۔ گوداوری کا ظالمانہ سلوک انہیں بہت ناگوار معلوم ہوتا۔

گوداوری کی آنکھیں اتنی کم بین نہ تھیں کہ پنڈت دیودت کی کیفیات قلب نظر نہ آئیں۔ ان کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے وہ گوداوری کو ان کے چہرہ پر موٹے حروف میں منقوش معلوم ہوتے۔ یہ علم اس کے سینے میں ایک طرف تو گومتی کے خلاف حسد کی آگ بھڑکاتا تھا۔ اور دوسری طرف پنڈت جی پر خود غرضی، بے وفائی اور دغا بازی کا الزام عائد کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ دل کی کدورت برور برور بڑھتی ہی گئی۔

— (۵) —

رفتہ رفتہ گوداوری نے پنڈت جی سے گومتی کا چرچا کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گویا اس کے نزدیک گومتی گھر میں تھی ہی نہیں۔ وہ اب نہ اس کے کھانے پینے کی خبر لیتی ہے۔ نہ کپڑے لے لے کی، ایک بار کئی دنوں تک اسے اپنے ناشتہ کرنے کو بھی نہ ملا۔ پنڈت جی آرام طلب آدمی تو تھے ہی وہ ان سب بے عنوانیوں کو دیکھتے مگر اپنی عافیت کے سمندر میں تلام پیدا ہونے کے خوف سے زبان نہ ہلاتے تھے۔ تاہم یہ آخری بے رحمی ان کے غیر معمولی تحمل و برداشت کے لیے بھی قاتل ثابت ہوئی۔ ایک دن انہوں نے گوداوری سے ڈرتے ڈرتے کہا: ”کیا آج کل گھر میں ناشتہ کے

یہ مٹھائی دٹھائی نہیں آتی ۔

گودادری نے ترش رو ہو کر جواب دیا۔ ”تم لاتے ہی نہیں۔ تو آئے کہاں سے، میرا کوئی نوکر بیٹھا ہے۔“

دیودت کے دل پر گودادری نے ان سے کبھی ایسے لہجہ میں بات چیت نہیں کی تھی۔ بولے آہستہ بولو جھنجھلانے کی تو میں نے کوئی بات نہیں کی۔

گودادری نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ مجھے تو جیسا آتا ہے ویسے بولتی ہوں۔ دوسروں کی سی میٹھی چکنی باتیں کہاں سے لاؤں؟

دیودت نے ذرا گرم ہو کر کہا۔ ”آج کل مجھے تمہارے مزاج کا کچھ رنگ ہی نہیں ملتا۔ بات بات پر الجھتی ہو۔“

گودادری کا چہرہ نصہہ کی آگ سے لال پیلا ہو گیا۔ میٹھی تھی، کھڑی ہو گئی۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ بولی ”اب تمہیں میری کوئی بات اچھی نہ لگے گی۔ اب تو سر سے پیر دل تک مجھ میں بلیب ہی بلیب بھرے ہیں۔ اب اور لوگ تمہاری مرضی کے مطابق کام کریں گے، مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہ لو بندوق کی کنجی۔ اپنے روپے پیسے سنبھال لو۔ یہ آئے دن کی جھنجھٹ مجھ سے نہیں برداشت ہو سکتی۔ جب تک نبھا تبھایا، اب نہیں نبھ سکتا۔“

پنڈت دیودت کو سکتہ سا ہو گیا جس شور و شر کا انہیں خدر شہ تھا۔ اس نے نہایت خوفناک صورت میں ان کے گھر میں قدم رکھا۔ وہ اور کچھ نہ بولی سکے اس وقت زیادہ بولنے سے بات بڑھنے کا اندیشہ تھا۔ وہ باہر چلے آئے، سوچنے لگے کہ میں نے گودادری کے ساتھ ایسی کون سی بے عزتوانی کی ہے جس کا یہ پھل بل رہا ہے۔



ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ کہ گودادری کے ہاتھ سے نکل کر گھر کا انتظام کیونکر ہو سکے گا۔ اس قلیل آمدنی میں وہ نہ جانے کون سا جگت کرتی تھی۔ اب ایسٹور کیسے پار لگائیں گے۔ کچھ نہیں اسے منانا پڑے گا۔ اور ہو ہی کیا سکتا ہے اگر موتی کیا کرے گی؟ سارا بوجھ میرے سر پڑے گا، مانے گی تو مگر مشکل سے۔

مگر پنڈت جی کے یہ خیالات باطل نکلے۔ جندوق کی وہ کنبی نہ ہر پٹی ناگن کی طرح وہیں آگن میں تین دن تک بڑی رہتی۔ کسی کو اس کے نزدیک جانے کی جرات نہ ہوتی۔

بچہ تھے دن پنڈت جی نے گویا جان پر کھیل کر کنبی اٹھالی۔ اس وقت انہیں ایسا محسوس ہوا۔ گویا کسی نے ان کے سر پر پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ آرام طلب آدمیوں کو اپنے مقررہ راستے سے ایک تل بھر ہٹنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ پنڈت دیودت جانتے تھے کہ میں اپنے دفتر کے باعث گھر کا انتظام نہیں کر سکتا تاہم ان سے اتنی ڈھٹائی نہ ہو سکی کہ وہ کنبی گومتی کو دے دیں۔ مگر یہ محض دکھاوا تھا کنبی دیکھنے کو پنڈت جی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ کام سب گومتی کو کرنا پڑتا تھا اس طرح خاندان پر حکومت کرنے کا آخری وسیلہ بھی گودادری کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اہل خانہ کے نام کے ساتھ جو عزت اور وقار وابستہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس کنبی کے ساتھ چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے گھر کی مہری، اور پڑوس کی خورتوں کے بدتاؤ میں فرق یہاں ہونے لگا۔ گودادری اب معزولی رانی تھی جس کا اختیار صرف دوسروں کی ہمدردی پر رہ گیا تھا۔

خانہ داری کے انتظام میں یہ تئیر ہوتے ہیں گود داری کی عادات میں بھی ایک افسوس ناک تغیر آنے لگا۔ جس دروں میں رہتے والی رشتہ نہیں ہے جو سارا دن میں رات دن اسی خانہ دان کے چرچے رہتے۔ دیکھو تو دنیا کیسی مطلب آہ ہے۔ غریب نے زبردستی دو اجلا بنایا۔ جان بوجھ کر اپنے پیروں میں کلباٹ مار لی۔ اپنے گھنے کپڑے تک اتار دیئے۔ گر اب روتے روتے آنچل بھیگتا ہے۔ تو سوت ہی ہے۔ شوہر نے بھی نظروں سے گرا دیا۔ بس اب لونڈی کی طرف نظر نہیں پڑی پڑی پیٹھ جلایا کرے۔ یہ بھی کوئی جینا ہے ؟

گود داری یہ ہمدردانہ باتیں سنتی اور اس کی آنتی حس اور بھی تیز ہوتی ہے اسے اتنا نہ سو جھٹا کر یہ زبانی نمکساریاں زیادہ تر نفسِ انسانی ہی کی جفا سے پیدا ہوتی ہیں۔

گود داری کو جس امر کا پورا التماس، اور پنڈت، دیوت کو جس کا ڈر خوف تھا۔ وہ بات نہ ہوتی۔ خانہ داری کے معاملات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو سکتی تھی۔ ہاں تجربہ نہ ہونے کے باعث پنڈت بھی کہے انتظام میں دلی مداخلت کرتے۔ آخر خیریت زیادہ پڑ جاتا تھا۔ مگر کام چلا جاتا تھا۔ ہاں گود داری کو گود میں ہی رکھ دینا چاہئے۔ ڈھنگ سے نظر آتے تھے جس میں انگ ہے۔ مگر انگ کی فراہمیت اس میں نہیں ہو سکتی۔ وہ دلی کو پھیلانے کے بدلے اور بھی تنگ کر دیتا ہے۔ اسے مگر میں کوئی نقصان ہو جانے سے گود داری کو رنج کے بجائے خوشی ہوتی ہے۔ برسات کے دن تھکے کئی دن آنت ب نظر نہ آتا۔ صندوق میں رکھے ہوئے کپڑوں میں چھپوڑی انگ لگ گئی

تیل کے اچار بگڑ گئے۔ گومتی کو ان چیزوں کو دھوپ میں رکھنے کا خیال نہ رہا۔ گودادری نے یہ نقصانات دیکھے۔ مگر اسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ ہاں دو چار چلی کٹی باتیں سنانے کا موقعہ البتہ ہاتھ آگیا۔ ماکن بنا ہی آتا ہے۔ یا ماکن کا کام کرنا بھی۔

پینڈت دیودت کی عادات میں بھی ایک تبدیلی نظر آنے لگی جب تک گودادری اپنے حسن انتظام سے گھر کا کام کاج سنبھالے ہوئے تھی۔ تب تک انہیں کسی چیز کی کمی نہیں کھلی۔ یہاں تک کہ ترکاری سبزی وغیرہ کے لیے بھی انہیں بازار نہ جانا پڑتا۔ مگر اب گودادری انہیں دن میں کئی کئی بار بازار جاتے دیکھتی ہے خانہ داری کا انتظام خراب ہونے کے باعث اکثر انہیں عین وقت پر بازار بھاگنا پڑتا ہے۔ گودادری یہ سب کا بایا پلٹ دیکھتی۔ اور سنا سنا کے کہتی یہی ہمارا ج ہیں۔ کہ ایک تنکا بھی نہ اٹھاتے تھے۔ اب دیکھتی ہوں سارے دن بازار میں ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنتی کہ میرے لکھنے پڑھنے میں ہرج ہوگا۔

گودادری کو ایک بار اس کا ثبوت مل چکا تھا۔ کہ پینڈت جی خرید و فروخت کے معاملہ میں بہت ہوشیار نہیں۔ اسی لیے اسے جب کپڑوں کی ضرورت ہوتی، تو وہ اپنے پڑوس کے ایک لالہ صاحب سے منگوایا کرتی تھی۔ پینڈت جی کو یہ بات بھول سی گئی تھی۔ کہ گودادری کو ساڑیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے سر سے تو جتنا بوجھ کوئی ہٹا دے۔ اتنا ہی اچھا تھا۔ خود بھی وہی کپڑے پہنتے جو گودادری منگا کر دے دیتی۔ انہیں نت نئے فیشن اور نمونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر اب کپڑوں کے لیے بھی انہیں کو بازار جانا ہوتا۔ لیکتہ بار گومتی کے

پاس ساڑیاں نہیں تھیں۔ پنڈت جی بازار گئے تو ایک بہت نفیس جوڑا لائے۔ بزانے من مانے دام لیے۔ ادھار سودا لینے میں پنڈت جی کو مطلق پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ گومتی نے وہ جوڑا گوداوری کو دکھایا۔ گوداوری نے دیکھا، اور پھر منہ پھیر کر بولی۔ بھلا تم نے انہیں کپڑے لانا تو سکھا دیا۔ مجھ تو سولہ سال گزر گئے۔ ان کے ہاتھ کالا یا ہوا کپڑا خواب میں پہنا بھی نصیب نہ ہوا۔

ایسے واقعے گوداوری کی آتشِ حسد کو اور بھی زیادہ مشتعل کیا کرتے تھے جب تک اسے یقین تھا کہ پنڈت جی فطرتاً روکھے ہیں۔ تب تک اسے اطمینان تھا۔ مگر اب ان کی یہ نئی نئی انگلیں دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ میں نے ہزار کوشش کرنے پر بھی جس محبت کو نہ پایا۔ اسے گومتی نے محض اپنے حسن سے جیت لیا۔ اسے اب یقین ہوا کہ میں جسے سچی محبت سمجھتی تھی۔ وہ فی الواقع ابلہ فریبی تھی۔ وہ محبت نہ تھی۔ نرمی خود مرضی تھی۔

### (۷)

اتفاق سے اسی زمانے میں گومتی بیمار پڑی۔ اٹھنے بیٹھنے کی شکستہ نہ رہی۔ گوداوری کھانا پکانے لگی۔ مگر اسے یقین نہ ہوا کہ گومتی واقعی بیمار ہے وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے کھانا پکوانے کے لیے یہ سوانگ رچا گیا ہے۔ پڑوسنوں سے کہتی کہ لونڈی بننے میں اتنی ہی کسر تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔

پنڈت جی کو آج کل کھانا کھاتے وقت بھاگا بھاگ سی پڑ جاتی ہے معلوم نہیں کیوں۔ وہ اکیلے گوداوری سے باتیں کرتے ڈرتے ہیں۔ جانے کیا لعن طعن کرنے لگے۔ اسی لیے کھانا کھاتے وقت وہ ڈرتے رہتے تھے۔ کہ کہیں وہ

منحوس گھڑی نہ آجائے۔ گودادری اپنی تیز لنگا ہوں سے ان کی یہ حالت دیکھتی اور دل میں اینٹھ کر رہ جاتی۔ ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ بولی، کیا مجھ سے بولنے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ دیکھتی ہوں کہیں تو رات رات بھر باتوں کا تار نہیں ٹوٹتا۔ پر میرے سامنے منہ نہ کھولنے کی بھی قسم کھالی ہے۔ گھر کا رنگ ڈھنگ تو دیکھتے ہو نہ۔ اب تو سب کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے!

پنڈت جی نے ہر نیچا کیے ہوئے جواب دیا۔ اُنھ جیسے چلتا ہے ویسے چلتا ہے اب اس فکر میں کیا اپنی جان دے دوں؟ جب تم یہی چاہتی ہو۔ کہ گھڑی میں مل جائے تو میرا کیا بس ہے۔

اس پر گودادری نے کچھ سخت باتیں کیں۔ بات بڑھ گئی۔ پنڈت جی اٹھ آئے۔ گودادری نے قسم دلا کر انہیں بٹھانا چاہا۔ مگر وہ نہ بیٹھے۔ تب اس نے رسوئیں اٹھا دیں۔ سارے گھر کو فاقہ کرنا پڑا۔ گومتی میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ بات چلے یہ کیسی بھی سخت کیوں نہ ہو وہ سہہ لیتی تھی۔ مگر بھوک کی برداشت اس سے نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لیے وہ کبھی برت (روزہ) نہ رکھتی تھی۔ ہاں بہت اعلیٰ کرنے سے جنم اٹھتی رکھ لیتی تھی۔ لیکن آج کل بیماری کے باعث اسے اور بھی بھوک لگتی تھی۔ جب اس نے دیکھا، کہ دپہر ہونے آئی، اور کھانا ملنے کی امید نہیں تو اس نے مجبور ہو کر بازار سے مٹھائی منگوائی۔ ممکن ہے، اس نے محض گودادری کو جلانے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ کیونکہ کوئی بھی ایک وقت کے بھوکے رہنے سے مرنے نہیں جاتا گودادری کے سر سے میر تک آگ لگ گئی۔ اس نے بھی فوراً اٹھایا مٹکوائی۔ اور آج کئی برس کے بعد خوب پیٹ بھر کے مٹھائی کھائی۔ یہ سب حد

کے کرشمے ہیں۔

جو گودادری دوپہر ہونے سے پہلے منہ میں پانی ڈالنا گناہ سمجھتی تھی وہی گودادری اب روزانہ علی الصباح ناشتے کے بغیر بے قرار ہو جاتی ہے۔ سر میں وہ ہمیشہ میٹھا تیل ڈالتی تھی۔ اب میٹھے تیل سے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ پان کھانے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اسے حد نے نئی نوپلی بہو بنا دیا۔

جنم اشٹمی کا مبارک دن آیا۔ پنڈت دیودت کی خلیقی بھوویت ان دو تین دنوں کے لیے رخصت ہو جاتی تھی۔ وہ بڑے جوش سے اس کی تیاریاں کرتے تھے۔ گودادری یہ برت بے آب ودانہ رکھتی تھی۔ اور پنڈت جی تو کرشن کے بھگت ہی تھے۔ ان کے لیے بے آب ودانہ رہنا لازمی تھا۔ ان کے اصرار سے اب کے گومتی نے بھی نرجل برت رکھنے کی جرأت کی۔ مگر اسے انتہا درجہ متعجب ہوا۔ جب ہماری نے کہا۔ بڑی بہو برت نہ رکھیں گی۔ ان کے لیے بازار سے پوریاں منگوا دیتا۔

شام کے وقت گودادری نے مان مندر جانے کے لیے یکہ کی فرمائش کی۔ گومتی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ مان مندر بالکل قریب تھا۔ اب یکے والے سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہ چڑھ کر بولی۔ فضول پیسے پھینکنے سے کیا فائدہ۔ مان مندر کون بڑی دور ہے۔ پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ فرمائش کر دینا آسان ہے، کھلتا ہے اس کو جو چھاتی پھاڑ کر کھاتا ہے۔

تین سال پہلے گومتی نے اس طرح کی باتیں گودادری کے منہ سے سنی تھیں آج

گودادری کو وہی باتیں اس کے منہ سے سننا پڑیں، دنوں کا بھیر!

گودادری ان دنوں بڑی بے دلی سے کھانا بناتی تھی۔ پنڈت جی کے پرہیز کے

معلق اسے اب پہلے کی سی احتیاط نہ تھی۔ ایک دن اس نے مہری سے کہا، کہ اندر سے مصالحوں نکال کر پیش لا۔ مصالحوں دال میں پڑے۔ تو دال ذرا تیز ہو گئی، مارے خوف کے پنڈت جی سے نہ کھائی گئی۔ اور آرام طلب آدمیوں کی طرح چپٹی چیزیں انہیں بھی سرگوب تھیں۔ لیکن مرقع کے ہاتھوں مجبور تھے۔ گو متی نے جب یہ ماجرا سنا۔ تو بھویں چڑھا کر بولی: ”کیا بڑھاپے میں زبان گز بھر کی ہو گئی ہے۔ کچھ اس طرح کی سخت باتیں پہلے گودادری نے بھی کہی تھیں۔ آج اس کی سننے کی باری تھی۔ نیرنگی نہ تو زور لگا رہا اسی کا نام ہے۔“

(۸)

آج گودادری گنگا سے ملنے آئی ہے۔ تین سال ہوئے، وہ ایک بار دو لہاؤں کو لے کر گنگا کو دودھ چڑھانے آئی تھی۔ آج وہ اپنی جان اسے نذر کرنے آئی ہے۔ آج وہ اس کی مسرت بار موجوں میں آرام کرنا چاہتی ہے۔

گودادری کو اس گھر میں ایک ایک لمحہ رہنا شاق تھا جس گھر میں لونڈی بن کر رہنا اس جیسی خود دار عورت کے لیے محال تھا۔

اب اس گھر سے گودادری کا تعلق صرف اس پرانی رستی کی طرح تھا۔ جو بار بار گرہ دینے پر بھی کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ ہی جاتی ہے۔ اسے گنگا جی کے دامن میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ نظر آتی تھی۔

کئی دن ہوئے اس کے منہ سے بار بار جان دے دینے کی دھمکی سن کر پنڈت جی غصے سے بول اٹھے تھے۔ تم کسی طرح مر بھی تو جاتیں۔ گودادری وہ زہریلے الفاظ اب تک نہ بھولی تھی۔ جیسے والی باتیں اس کے دل پر پتھر کی لکیر بن جاتی تھیں۔ آج

گومتی نے بھی دینی باتیں کہیں۔ اگرچہ اس نے بہت کچھ سنے پر یہ الفاظ زبان سے نکلے تھے۔ مگر گودادری کو اپنی باتیں تو بھول گئی تھیں۔ صرف گومتی کی باتیں کان میں گونج رہی تھیں، آہ! اور پنڈت جی نے اسے ڈانٹا تک نہیں۔ چہرہ پر ایسا غصہ ڈھایا جائے۔ اور وہ زبان تک نہ کھولیں۔

آج سب لوگوں کے چلے جانے پر گودادری گھر سے باہر نکلی۔ آسمان پر کالے گھٹائیں جھائی ہوئی تھیں۔ پانی کی چھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریاں بہ رہی تھیں۔

محبت کی زنجیر کتنی مضبوط ہے۔ اور پھر کتنی نازک! نازک ہے۔ دغا کے سامنے مضبوط ہے۔ بیوگ کے سامنے، گودادری چوکھٹ پر کھڑی کھڑی گھنٹوں روتی رہی۔ کتنی ہی پچھلی باتیں اسے یاد آتی تھیں۔ کبھی اسی گھر میں اس کے لیے محبت بھی تھی عزت بھی تھی۔ زندگی کا سکھ بھی تھا۔ مگر اب کیا ہے! فوراً پنڈت جی کی وہ دل خراش باتیں یاد آ گئیں۔ آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ گودادری گھر سے چل کھڑی ہوئی۔ اس وقت اگر پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے پاؤں، پانی میں بھگتے، دوڑتے آتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گودادری کو کپڑا کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگالیتے اور کہتے "پیارے" اس کے سوا ان کی زبان سے اور کچھ نہ نکلتا۔ کیا تب بھی گودادری اپنے ارادے پر قائم رہتی؟

کنوارہ کا ہیمنہ تھا۔ رات کو گنگا کی لہروں کی گرج بہت خوف ناک معلوم ہوتی ساتھ ہی یکایک بجلی کو بند جاتی، تو اچھلتی ہوئی لہریں روشنی میں ایسی معلوم ہوتیں گویا روشنی خود مست ہاتھوں کے جسم میں کلیں کر رہی ہے۔ نزاع ہستی کا ایک



خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے پھیل رہا تھا۔

گوداوری کے سینے میں بھی اس وقت خیالات کی پرستور لہریں اٹھتی تھیں اور آپس میں ٹکراتی تھیں۔ کہاں؟ تاریکی میں جہاں کچھ نہیں تھا۔

کیا یہ گرجتے اٹلنے والی گنگا گوداوری کے دل بے قرار کو تسکین دے سکتی ہے؟ اس کی لہروں سے نغمہ شیریں کی صدا میں نہیں آتیں۔ اس کی آنکھوں میں رَم کی جھلک نہیں ہے۔ وہ اسی وقت غنیمت اک اور پرورش ہیں۔

گوداوری کنارے پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی۔ کون کہاں رہتا ہے؟ کیا اب بھی اسے یہ دکھایا نہیں تھا۔ کہ پنڈت دیوت اتنے نہ ہوں؟ پریم کی رسی کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

اسی تاریکی میں حسد اور یاس اور بے مہری کے لہجوں ستائی ہوئی یہ دکھایا گنگا

کی گود میں گر پڑی۔ لہریں چاروں طرف جھپٹیں، اور اُسے لنگل گئیں۔

سو برا ہوا گوداوری گھر میں نہیں تھی۔ اس کی چارپائی پر یہ خطر پڑا ہوا تھا۔

”سوامی جی! دنیا میں آپ کے سوا اور میرا کون تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ آپ کے

سکھ کی نظر کر دیا۔ اب آپ کا سکھ اسی میں ہے۔ کہ میں اس دنیا میں نہ رہوں اسی

بے یہ جان بھی اب آپ کی نذر ہے۔ مجھ سے جو کچھ خطائیں ہوتی ہوں۔ انہیں معاف

کیجیے گا۔ ایسا تو آپ کو سدا سکھی رکھے۔“ پنڈت جی اس خط کو پڑھتے ہی غش کھا کر گر

پڑے۔ گومتی رونے لگی۔ مگر معلوم نہیں کیا سوچ کر؟۔

## سیر پر غرور

شام ہو گئی تھی۔ میں سر جوندی کے کنارے اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا دریا کا لٹھٹا اٹھا رہا تھا کہ میرے فٹ بال نے دبے پاؤں قریب آکر مجھے سلام کیا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ”فٹ بالی“ کے نام سے جس مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ وہ میرا دلی تھا۔ اسے صرف ایک نظر دیکھنے سے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ نام اس کے لیے کامل طور پر موزوں ہے۔ وہ سرتاپا ایک انسانی اور لمبی جرم تھا۔ عرض و طول مساوی۔ اس کا مدور شکم جس نے اس دائرہ کے بنانے میں خاصی حصہ لیا تھا۔ ایک لمبے کمر بند میں لپٹا رہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ انتہا سے آگے نہ بڑھ جائے جس وقت وہ تیزی

سے چلتا تھا۔ نہیں بلکہ لڑھکتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فٹ بال  
ٹھوکر کھا کر لڑھکتا چلا آتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
”کیا کہتے ہو؟“

اس پر فٹ بال نے ایسی ردنی صورت بنائی۔ گویا کہیں سے  
پٹ کر آیا ہے اور بولا۔ حضور ابھی تک یہاں رسد کا کوئی انتظام  
نہیں ہوا۔ زیندار صاحب کہتے ہیں کہ میں کسی کانوکر نہیں ہوں۔  
میں نے اس نگاہ سے دیکھا۔ گویا میں اور زیادہ نہیں سننا چاہتا  
غیر ممکن تھا کہ ایک مجسٹریٹ کی شان میں زیندار سے ایسی گستاخی  
سرزد ہوتی۔ یہ میرے حکامانہ غصے کو مشعل کرنے کی ایک بے تمیزانہ  
کوشش تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”زیندار کون ہے؟“

فٹ بال کی باچھیس کھل گئیں۔ بولا دکنور سبجن سنگھ۔ حضور  
بڑا سرکش آدمی ہے۔ رات ہونے آئی ہے اور ابھی تک حضور کے  
سلام کو سبھی نہیں آیا۔ گھوڑوں کے سامنے نہ گھاس ہے۔ نہ دانہ  
شکر کے سب آدمی مہو کے بیٹھے ہیں۔ مٹی کا ایک برتن بھی نہیں  
بھیجا۔

مجھے زینداروں سے رات دن سابقہ رہتا تھا۔ مگر یہ شکایت  
کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس کے برعکس وہ میری خاطر و تواضع  
میں ایسی جانفشانی سے کام لیتے تھے۔ جو خود داری کے شایاں نہ تھی  
اس میں فیاضانہ ہمال نوازی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ نہ اس میں تکلف تھا

نہ نمود شردت جو عیب ہے مگر سفلہ پن سے خالی۔ اس کے بجائے وہاں رسوخ بیجا کی فکر اور خود مطلبی کی ہوس صاف نظر آتی تھی اور اس رسوخ طلبی کی قیمت شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ان بے نواؤں سے وصول کی جاتی تھی۔ جن کا بیکسی کے سوا اور کوئی دستگیر نہیں۔ ان کے طرز کلام اور آداب میں وہ علامت اور عاجزی برتی جاتی تھی جن کا اعتبار حسنِ ظن کے ساتھ بُر ہے اور اکثر ایسے موقعے آتے تھے جب ان خاطر داریوں سے تنگ ہو کر دل چاہتا تھا کہ کاش ان حریفوں اور خوشامدی آدمیوں کی صورت نہ دیکھنا پڑتی۔

مگر آج اپنے فٹ بال کی زبان سے یہ کیفیت سن کر میری جو حالت ہوئی اس نے ثابت کر دیا کہ روزانہ خاطر داریاں اور شیریں کلامیاں مجھ پر بے اثر نہیں ہوئی تھیں۔ میں یہ حکم دینے ہما والا تھا۔ کہ کنور سجن سنگھ کو حاضر کرو کہ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ان مفت نورے چٹا سیلوں کے کہنے پر ایک مغرز آدمی کو مطعون کرنا قرین انصاف نہیں۔ اردلی سے کہا: بلیوں کے پاس جاؤ نقد دام دے کر چیریں لاؤ اور یاد رکھو کہ میرے پاس کوئی شکایت نہ آئے۔

اردلی دل میں مجھے نفرت کرتا ہوا چلا گیا۔

مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب دہاں ایک مہفتہ تک مقیم رہنے پر بھی مجھے کنور صاحب سے نیاز نہ حاصل ہوا۔ اپنے معمول اور لشکر والوں کی زبان سے کنور صاحب کی سرکشی اور غرور اور

ہیکسٹری کی داستانیں روزِ سنّا کرتا اور میرے جہانِ دیدہ پیشکار نے ایسے ناچھان نواز گاؤں میں پڑاؤ ڈالنے کے لیے مجھے کئی بار کناشیہ فہاش کی۔ غالباً میں پہلا شخص تھا جس سے یہ خطا سرزد ہوئی تھی اور اگر میں نے ضلع کے نقشے کے بجائے لشکر والوں سے اپنے دورہ کا بردگرا م بنانے میں مدد لی ہوتی تو شاید اس ناگوار تجربہ کی نوبت نہ آتی لیکن کچھ عجیب بات تھی کہ کنور صاحب کی خدمت مجھے پرائیڈ اثر ڈالتی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے اس شخص سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ہوا جو ہمہ گیر اور ہمہ کن افسروں سے اس قدر بے نیاز رہ سکتا ہے۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ گڑھی میں گیا۔ نیچے سر جو ندی لہریں مار رہی تھی۔ اس پار سا بھوکا جنگل تھا۔ میلوں تک باوامی ریت اس پر خربوزہ اور تر بوز کی کیاریاں تھیں۔ زرد پھولوں سے لہراتی ہوئی بنگلوں اور مرغابیوں کے غول کے غول پیٹھے ہوئے تھے۔ سورج دیوتانے جنگلوں سے سر نکالا۔ لہریں جگمگائیں۔ پانی میں تارے نکلے۔ سہانا روح افسرِ منظر تھا۔

میں نے اطلاع کی اور کنور صاحب کے دیوان خانہ میں داخل ہوا و سیاح کمرہ تھا۔ فرش سے آرامتہ۔ سامنے منہ پر ایک نہایت قوی ہیکل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سر کے بال منڈے ہوئے گلے میں رددراکش کی ایک مالا۔ سرخ آنکھیں۔ اونچی پیشانی مردانہ غرور کی اس سے بہتر تصور نہیں

ہو سکتی۔ چہرہ سے ہلہیت اور رعب برستا تھا۔

کنور صاحب نے میرے سلام کو اس انداز سے لیا۔ گویا وہ اس کے عادی ہیں۔ منہ سے اٹھ کر انہوں نے نہایت مریبانہ انداز سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ خیریت پوچھی۔ اور اس تکلیف کے لیے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد عطر پاؤں کی توضیح کی۔ تب وہ مجھے اپنی گڑھی کی سیر کرانے چلے جس نے کسی زمانہ میں ضرور آصف الدولہ کو زچ کیا ہوگا۔ مگر اس وقت شکستہ حالی تھی۔ یہاں کے ایک ایک روڑے پر کنور صاحب کوناز تھا۔ ان کی خاندانی عظمت اور اقتدار کا تذکرہ۔ ان کی زبان سے سن کر باور نہ کرنا غیر ممکن تھا۔ ان کا طرز بیان یقین کو مجبور کرتا تھا اور وہ ان روایات کے محض پاسبان ہی نہ تھے بلکہ یہ ان کے ایمان کا جزو تھیں اور جس قدر ان کے امکان میں تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں میں کبھی فروگذاشت نہیں کی۔

کنور صاحب شگہ خاندانی رئیس تھے ان کا سلسلہ نسب بجا بجا لڑتا ہوا آئندہ کسی جہانماری سے مل جاتا تھا۔ گویا انہیں اب عبادت و ریاضت کا دھوئے نہ تھا لیکن اس کا فخر ضرور تھا کہ وہ ایک رشی کی اولاد ہیں۔ بزرگوں کے جنگی کارنامے بھی ان کے لیے کچھ کم باعث فخر نہ تھے۔ ان کا تاریخ میں کہیں ذکر نہ ہو مگر خاندانی بھاٹ نے انہیں امر بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی اور اگر الفاظ میں کچھ طاقت ہے تو یہ گڑھی روہتاس یا کالنجہر کے قلعوں پر بھی سلطنت رکھتی تھی۔

کم سے کم قدامت اور پامالی کی ظاہری علامتوں میں تو اس کی مثال مشکل سے مل سکتی تھی۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں پہلے سے اس نے محاصروں اور سرنگوں کو حقیر سمجھا ہو۔ لیکن اس وقت وہ جیو پیٹول اور دیگوں کے حلوں کی بھی مدافعت نہ کر سکتی تھی۔

کنور سبھی سنگھ سے میری ملاقات بہت مختصر تھی لیکن اسی دلچسپ انسان نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنالیا۔ نہایت ذکی و بکثرتِ سخن دور رس آدمی تھا جس سے اس کا بندہ بے درم ہونا تھا۔

(۳)

برسات میں سر جو ندی اسی زور شور سے پڑھی کہ نہاردی گاؤں غارت ہو گئے۔ بڑے بڑے تناور درخت تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے تھے۔ چار پائیوں پر سوتے ہوئے بچے اور عورتیں۔ کھونٹے پر بندھے ہوئے گائے اور بیل۔ اس کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما گئے۔ کھیتوں میں ناؤ چلتی تھی۔

شہر میں اڑتی ہوئی خبریں پہنچیں۔ امداد کے ریزولیشن پاس ہوئے۔ سیکرٹریوں نے ہمدردی اور رنج کے ارجنٹ تارھٹلے کے بڑے صاحب کی خدمت میں روانہ کیے۔ ٹاؤن ہال میں قومی ہمدردی کی پُر شور ہڈائیں بلند ہوئیں اور اس ہنگامے میں ستم رسیدوں کے پُر در دنا لے دب گئے۔

سبرکار کے کانوں میں فریاد پہنچی۔ ایک تحقیقاتی کمیشن تعینات

کی گئی۔ زمینداروں کو حکم ہوا کہ وہ کمیشن کے روبرو اپنے نقصانات کی  
 تفصیل بیان کریں اور اس کے ثبوت دیں۔ شیو رام پور کے مہاراجہ  
 صاحب کو اس کمیشن کی صدارت کا منصب عطا ہوا۔ زمینداروں میں  
 ریل پیل شروع ہوئی۔ نصیب بھاگے۔ نقصان کے تخمینہ کے تصفیہ میں  
 شاعرانہ سخن شناسی سے کام لینا پڑا۔ صبح سے شام تک کمیشن کے  
 روبرو ایک جگمگھٹ رہتا تھا۔ آنریبل مہاراجہ صاحب کو سانس لینے  
 کی فرصت نہ تھی۔ دلیل اور شہادت کا کام سخن سازی اور خوشامد  
 سے لیا جاتا تھا۔ مہینوں یہی کیفیت رہی۔ لب ساحل کے سب ہی  
 زمیندار اپنے نقصان کی فردیں پیش کر گئے۔ اگر کوئی کمیشن سے  
 بے فیض رہا تو وہ کنور سجن سنگھ تھے۔ ان کے سارے موضع سر جو  
 کے کنارے پر تھے اور سب تباہ ہو گئے تھے۔ گڈھی کی دیواریں بھی اس  
 دستبرد سے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ مگر ان کی زبان خوشامد سے نا آشنا تھی۔  
 اور یہاں اس کے بغیر رسائی مشکل۔ چنانچہ وہ کمیشن کے روبرو صورت  
 سوال بنے ہوئے نہ آ سکے۔ میعاد ختم ہونے پر کمیشن نے رپورٹ پیش کی  
 سیلاب میں ڈوبے ہوئے علاقوں میں لگان کی عام معافی ہو گئی۔ رپورٹ  
 کے مطابق صرف سجن سنگھ ہی وہ خوش نصیب زمیندار تھے جن کا کوئی  
 نقصان نہیں ہوا تھا۔ کنور صاحب نے رپورٹ سنی مگر پیشانی پر بل نہ  
 آیا۔ ان کے آسامی گڈھی کے صحن میں جمع تھے۔ یہ حکم سنا تو وہ دزاری  
 کرنے لگے۔ تب کنور صاحب اٹھے اور بلند آواز سے بولے ”میرے



علاقے میں بھی معافی ہے۔ ایک کوڑی لگان نہ لیا جائے گا، میں نے یہ واقعہ سنا اور خود بخود میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بے شک یہ وہ شخص ہے جو حکومت اور اختیار کے طوفان میں جبر سے اٹھ چاہے۔ مگر خم نہ ہو گا۔

(۴)

وہ دین بھی یادگار رہے گا۔ جب احمد دھیا میں ہمارے بھادو نگار زندہ جہادید شکر کو قوم کی جانب سے مبارکباد پیش کرنے کیلئے عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ہمارا مایہ ناز۔ ہمارا پیر جوش۔ نازک بیان شکر یورپ اور امریکہ پر اپنے کلام کا جادو کر کے واپس آیا تھا۔ اپنے کمالات پر ناز کرنے والے یورپ نے اس کی پرستش کی تھی۔ اس کے جذبات نے براؤٹنگ اور شیلے کے عاشقوں کو بھی پابند و فائدہ رہنے دیا۔ اُس کے آب حیات سے تشہ کا مانی یورپ سیراب ہو گئے۔ ساری جذبہ دنیا نے اس کی پرواز بلند کر کے آگے سر بھکا دیے۔ اسی سہ بھارت کو یورپ کی نگاہوں میں اگر زیادہ نہیں تو لیونان اور روم کے پہلو میں بٹھا دیا تھا۔

جب تک وہ یورپ میں رہا روزانہ اخبارات کے صفحات اُس کے تذکروں سے پُر ہوتے تھے۔ یونیورسٹیوں اور علماء کی انجمنوں نے اس پر خطابات کی سو لاکھ بار بارش کر دی تھی۔ وہ تھنہ انتقام جہاں یورپ کا پیارا بخواہ اور زندہ آئینہ ہے۔ وہ تھنہ ہمارے پیارے

نزدہ کن شکر کے سینہ پر زیب دے رہا تھا اور اس کی دلچسپی کے بعد آج انہیں قومی خدمات پر اظہار عقیدت کے لیے ہندوستان کے دل اور راسخ ابودھیا میں جمع تھے۔

اسی ابودھیا کی گود میں سرکاری رام چندر رکھیلے تھے اور وہیں انہوں نے والیک کی سحر نگاریوں کی داد دی تھی۔ اسی ابودھیا میں ہم اپنے شیریں کلام شکر پر اپنی محبت کے پھول چڑھانے آئے تھے۔

اس قومی عرض میں حکام سرکاری بھی نہایت فیاضی کے ساتھ ہمارے شریک تھے۔ شکر نے شملہ اور دار جیلنگ کے فرشتوں کو بھی ابودھیا میں کھینچ لیا تھا۔ ابودھیا کو بہت انتظار کے بعد یہ دل دیکھنا نصیب ہوا۔

جس وقت شکر نے وسیع شامیانہ میں قدم رکھا۔ ہمارے دل قومی غرور اور نشہ سے متوالے ہو گئے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ ہم اس وقت کسی زیادہ پاک، زیادہ روشنی دنیا کے بنے والے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے، افسوس صرف ایک لمحہ کے لیے۔ اپنی بستی اور پادالی کا خیال ہمارے دلوں سے دور ہو گیا اچھے بچے ابکی سداؤں نے ہمیں اس طرح مست کر دیا جیسے فہور ناگ کو مست کر دیتا ہے۔

ایڈریس پڑھنے کا فخر مجھے حاصل ہوا تھا۔ سارے بنگالیوں نے خاموشی کا عالم طاری تھا۔ جس وقت میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ”اے قوم کے رہنما! اے ہمارے روحانی گرو! ہم سچی محبت سے

تہیں مبارک باد دیتے ہیں۔ اور سچی ارادت سے تمہارے قدموں پر سر جھکاتے ہیں۔۔۔۔۔" بیکایک میری نگاہ اٹھی اور میں نے ایک قومی ہیکل آدمی کو تعلقہ داروں کی صف سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا یہ کنور سجن تھے۔

مجھے کنور صاحب کی یہ بے موقع حرکت جسے بد تہذیبی خیال کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ برمی معلوم ہوئی۔ ہزاروں آنکھیں ان کی طرف حیرت سے اٹھیں۔

جلیسے کے ختم ہوتے ہی میں نے پہلا کام ہو کیا۔ وہ کنور صاحب سے اس امر کے متعلق جواب طلب کرنا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں صاحب! آپ کے پاس اس بے موقع فعل کا کیا جواب ہے؟"

سجن سنگھ نے متانت سے جواب دیا۔ "آپ سننا چاہیں تو

دوں۔"

شوقی سے فرمائیے۔"

اچھا تو سنئے۔ "میں شکر کے کلام کا دلزدہ ہوں۔ شکر کی عزت کرتا ہوں۔ شکر پر ناز کرتا ہوں۔ شکر کو اپنا اور اپنی قوم کا محسن سمجھتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں اپنا روحانی گور و ماننے یا ان کے قدموں پر سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

میں حیرت سے ان کا متہ تکتارہ گیا۔ یہ انسان نہیں غرور کا

پتلا ہے۔ دیکھیں یہ سر کبھی جھکتا ہے یا نہیں۔

(۵)

پورنماش کا پورا چاند سر جو کے سنہرے فرشی پر ناچتا تھا اور  
لہریں خوشی سے گلے مل کر گاتی تھیں۔ یہ پھاگن کا مہینہ تھا۔  
پیٹرول میں کوئیلز نکلی تھیں اور کوئل کو کئے لگی تھی۔

میں اپنا دورہ ختم کر کے صدر ٹوٹتا تھا۔ راستہ میں کنور سجن سنگھ  
کے فیض صحبت کا اشتیاق مجھے ان کے در دولت تک لے گیا جواب  
میرے لیے خانہ بے تکلف تھا۔

میں شام کے دریا کی سیر کو چلا۔ وہ ہواٹے جہاں پر وہ درختاں  
لہریں۔ وہ روحانی سکوت۔ سارا منظر ایک دلاؤیز پر مزہ نواب  
تھا۔ چاند کے نغمہ درختاں سے جس طرح لہریں جھوم رہی تھیں۔ اسی  
طرح فکر شیریں سے دل اُٹا آتا تھا۔

مجھے اوجھڑے کڑاڑے پر ایک درخت کے نیچے کچھ روشنی نظر  
آئی۔ میں اوپر چڑھا۔ وہاں برگد کے گھنے سایہ میں ایک دھونی جل  
رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک سادھو پیر پھیلائے۔ برگد کی ایک  
موٹی جٹا کے سہارے لیے ہوئے تھے۔ ان کا نورانی چہرہ آگ کی چمک  
کو لجاتا تھا۔ نیلے تالاب میں کنول کھلا ہوا تھا۔

ان کے پیروں کے پاس ایک دوسرا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس  
کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ اس سادھو کے پیروں پر اپنا سر رکھے

ہوئے تھا۔ قدموں کو چومتا تھا اور آنکھوں سے لگاتا تھا۔ سادھو اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے ہوئے تھے۔ گویا ہوس صبر اور قناعت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ بھولا لڑکا ماں باپ کی گود میں آ بیٹھا تھا۔

دفعۃً وہ سر پر خم اٹھا اور میری نگاہ اس کے پیرے پر پڑی مجھے سکتا سا ہو گیا۔ یہ کنور سچن سنگھ تھے۔ وہ سر جو خم ہونا نہ جانتا تھا۔ اس وقت زمین بوس تھا۔

وہ ماتا جو ایک اعلیٰ منصب دار کے سامنے نہ جھکا جو ایک باثروت اور با اختیار ہمارا بھ کے سامنے نہ جھکا جو ایک باکمالی قوم پرست شاعر اور فلاسفر کے سامنے نہ جھکا۔ اس وقت ایک سادھو کے قدموں پر گرنا ہوا تھا۔ غرور، ترک اور استغناء کے سامنے سرنگوں ہو گیا تھا۔ میرے دل میں اس عبرت ناک نظارہ سے عقیدت کا ایک ولولہ پیدا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا اور کنور سچن سنگھ کا روحانی مرتبہ دکھائی دیا۔ میں کنور صاحب کی طرف چلا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن میں ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا "میرے دوست! میں آج تک تمہاری روحانی عظمت سے بالکل بے خبر تھا۔ آج تم نے میرے دل پر نقش کر دیا کہ جاہ اور ثروت، کمال اور مشہرت یہ سب سفلی اور مادی ہیں۔ ان کے ناز بردار اس قابل نہیں کہ ہم ان کے سامنے فرق نیاز جھکائیں۔"

ترک اور تسلیم ہی وہ علوی صفات ہیں جن کے آستانہ پر ہشت اور  
جہاں سے بے نیاز سر بھی جھک جاتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو  
جہاں وحش کو بادہ غرور کے متوالوں کو اور تاج مرصع کو اپنے قدموں  
پر گرا سکتی ہے۔ اے کنج خلوت میں بیٹھنے والی رو سو! کہ تم دھنیہ  
ہو کہ غرور کے نپلے بھی تمہارے پیروں کی دھول کو ماتھے پر چھاتے  
ہیں۔

کنور سجن سنگھ نے مجھے چھاتی سے لگا کر کہا: "مسٹر وانگلے  
آج آپ نے مجھے سچے غرور کی صورت دکھا دی اور میں کہہ سکتا  
ہوں کہ سچا غرور سچی عبادت سے کم نہیں۔ یقین مانیں مجھے اس  
وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غرور میں بھی روحانیت کا باس  
ہو سکتا ہے۔ آج میرے سر میں غرور کا جو نشہ ہے وہ کبھی  
نہیں تھا۔"

---

## اصلاح

ڈرگامالی ڈاکٹر عرفان علی بار ایٹ لاکے یہاں نوکرتھا۔ پانچ روپیہ تنخواہ تھی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کے لیے گھس پیس دیا کرتی تھی۔ دو بچے جو رازی شہور تھے۔ ادھر ادھر سے لکڑیاں اُپلے وغیرہ چن لاتے تھے۔ مگر تاہم ان کی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ درگاداکٹر صاحب کی نظر بچا کر بانچہ سے پھول چن لیا کرتا۔ اور بازار میں بیماریوں کے لاکھ بیچ دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دست غنیمت پھولوں پر بھی جا پڑتا تھا۔ یہ اس کی بالائی آمدنی تھی۔ اس سے روزانہ نمک نیل کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اضافہ تنخواہ کی التجا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اضافہ کی کوئی معقول وجہ نہ آتی تھی۔ وہ صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ بھی میں تمہیں جبراً تو نہیں روکتا۔ تمہارا یہاں نباہ نہیں ہوتا۔ کہیں اور

تلاش کرو۔ میرے لیے مالیوں کا قحط نہیں ہے۔ درگاہیں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ لگا ہوا روزگار چھوڑ کر دوسری نوکری ڈھونڈنے نکلتا۔ اس سے زیادہ تنخواہ ملنے کی اسے امید بھی کم تھی۔ اس لیے درویشِ برجانِ درویشِ پڑا دن کاٹتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کو رد کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو باغبانی کا خاص دوق تھا۔ انواع و اقسام کے پھول پتے لگا رکھے تھے۔ اچھے اچھے پھولوں کے درخت، یلح آباد، سہارن پور، دربھنگہ وغیرہ مقامات سے منگوا کر لگائے تھے۔ درختوں کو پھل سے لدا ہوا دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ اپنے احباب کے یہاں اکثر گلہ سستے اور سبزیاں وغیرہ تحفہً بھجواتے رہتے تھے۔ انہیں خود کھانے کا شوق نہ تھا۔ مگر کھلانے میں دوستوں کی دعوت اٹھا کرتے۔ پلنگ پارٹیاں ان کے مشغلہ تفریح کا ایک خاص جزو تھیں۔

ایک بار گرمیوں میں انہوں نے اپنے کئی اہم مشرب دوستوں کو اُم کی دعوت دی۔ ایک یلح آبادی سفیدے میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ انہیں وہ روزانہ چہل قدمی کرتے وقت دیکھا کرتے تھے۔ اس خیال سے انہیں وہی خوشی ہوتی تھی جو کسی پہلوان کو اپنے پٹھوں کے کرتب دکھانے سے ہوتی ہے۔ اتنے بڑے خوش رنگ پھل خود ان کی نگاہ سے کبھی نہ گزرتے تھے۔ پھلوں کی شیرینی کا انہیں اتنا کامل یقین تھا کہ وہ چکھ کر اپنا اطمینان کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس خود پروری سے وہ اپنے کسی ایک دوست کو لطفِ ذائقہ سے محروم کر دیں گے۔

شام کا وقت تھا۔ چیت کا بیسہ۔ احباب باغیچہ میں آکر حوض کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے، برف اور دودھ کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے



پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے دکھلا کر تب انہیں تڑوانا چاہتے تھے۔ تاکہ کسی کو یہ شک کرنے کا موقع نہ ملے کہ پھل اس باغ کے نہیں ہیں۔ جب سب حضرات جیسے ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا: ”آپ لوگوں کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر ذرا چل کر پھلوں کو درخت میں چلے ہوئے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ گلاب میں بھی ایسی دلا دیز سرخی نہ ہوگی۔ رنگ سے ملاحظہ کیجی پڑتی ہے۔ ان کی رنگت اور صورت اس درخت سے رغبت انگیز ہے۔ کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ قلم خاص بلج آباد سے منگوایا تھا۔ اور اس کی خاص طور پر نگہداشت کی گئی ہے۔“

اجاب اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب میزبان کی حمیت سے آگے آگے چلے۔ ردشوں کی دونوں طرف گلاب کے تختے تھے۔ ان کی بہار دکھلاتے ہوئے وہ بالآخر سفیدہ کے درخت کے سامنے آگئے۔ مگر وہاں ایک پھل بھی نہ تھا۔ انہوں نے خیال کیا۔ شاید یہ درخت نہیں ہے۔ دو قدم اور آگے چلے۔ دوسرا درخت مل گیا اور آگے بڑھے۔ کٹھن کا درخت اُگیا۔ پھر پیچھے لوٹے۔ اور تعجب کرتے ہوئے سفیدہ کے درخت کے سامنے ٹک گئے۔ پھل کیا ہوئے؟ درخت تو یہی ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ مگر پھل کہاں گئے؟ دوستوں کی طرف خطا دارانہ انداز سے دیکھا اور معافی طلب لہجے میں بولے۔ ”ضرور مالی کی شرارت ہے۔ دیکھئے میں کم بخت کو ابھی بلاتا ہوں۔ میں حد درجہ نادم ہوں۔ کہ آپ صاحبوں کو ناقص تکلیف ہوئی۔ واللہ مجھے اس وقت جتنا ملال ہے۔ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ایسے خوش ذائقہ، خوش رنگ، خوشنما پھل میں نے اپنی

زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ ان کے یوں تلف ہوتے کا مجھے بے انتہا قلق ہے۔  
 یہ کہتے ہوئے وہ ایک انداز شہادت سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اجباب نے  
 کہا ”جناب آپ ہم لوگوں کی تکلیف کا خیال نہ فرمائیں، وہ نہ سہی۔ دوسرے پھل  
 سہی“ ایک رنگین طبع صاحب بولے۔ جناب مجھے تو سب آم ایک ہی سے  
 لگتے تھے۔ سفیدے، موہن جھوگ، لنگڑے، بمبئی فخری، دسہری اس میں  
 کوئی فرق معلوم ہوتا۔ معلوم نہیں کیونکر آپ لوگوں کو ان کی لذتوں میں امتیاز  
 معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے صاحب نے فرمایا: ”یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔ اس وقت  
 جو موجود ہوں۔ وہی منگوائیے۔ جو گئے ان کا افسوس بے سود ہے۔“  
 عرفان علی حضرت آقاؑ کی کیا کمی ہے سارا باغ بھرا ہوا ہے۔ خوب  
 شوق سے کھائیے۔ مگر وہ لطافت اور نزاکت کہاں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔  
 وہ ان سفیدوں پر ایسا نکھار تھا کہ بالکل سیب معلوم ہوتے تھے۔ سیب  
 خوشمضر و معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ رعبت انگیز لطافت کہاں؟ ایسا  
 معلوم ہوتا تھا کہ شجر آرزو میں وصال کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ واللہ سخت  
 افسوس ہے، کمال افسوس ہے۔ اس مالی نے آج وہ حرکت کی ہے کہ جی چاہتا  
 ہے۔ نمک حرام کو گوئی مار دوں۔ اس وقت سامنے آجائے تو ادھ مو کر دوں،  
 (مسکرا کر) اگر خدا نخواستہ کل مجھ پر ضرب شدید کا کوئی استغاثہ ہو تو آپ  
 لوگ شاہد رہیے گا۔ کہ مجھے کس قدر روحانی اشتعال ہوا ہے۔  
 مالی کا پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سائیس سے آم نطر وائے، دوستوں نے

ام کھائے۔ دو دھ پیٹ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نقصانِ عظیم کا مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہیں حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں یہ مالی کے انتظار میں قطب از جہانے جنبہ بنے بیٹھے رہے۔

————— (۲) —————

دُرگاشام کو بازار سے لوٹا۔ وہ چوکنی نظروں سے ادھر ادھر تاگتا آتا تھا۔ جونہی اس نے ڈاکٹر کو حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں یہ بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ سمجھ گیا کہ چوری پکڑ لی گئی۔ اس خوف سے آج اس نے آنے میں مدد اذیر کی تھی اس نے سمجھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہیں سیر کرنے گئے ہوں گے۔ میں کٹھنل کے درخت کے نیچے اپنے جھونپڑے میں جا بیٹھوں گا۔ صبح کو پوچھ پانچھ ہونی بھی تو مجھے صفائی دینے کا موقع رہے گا۔ سرکار میری تلاشی لے لیں۔ اس طرح معاملہ دب جائے گا۔ چور وقت کو اپنی بریت کی بہترین دلیل سمجھتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اسے دلیر بنا جاتا ہے۔ لیکن رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑے جانا اس کے لیے تہر ہے۔ وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔ اس کی سید زوری سلب ہو جاتی ہے۔ خون کے سُکھے رنگ کے داغ بن سکتے ہیں لیکن تازہ خون آپ ہی آپ پیکارتا ہے۔ دُرگاکے پیر ختم گئے۔ سیدہ دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑ گئی تھی۔ اب واپس کا ارادہ بے کار تھا۔ ڈاکٹر صاحب دور سے دیکھتے ہی اٹھے۔ کہ چل کر خوب مرمت کروں لیکن بیرسٹر تھے۔ خیال آگیا کہ اس کا بیان لینا ضروری ہے۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اور پوچھا، ”سفیدہ میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بھی نظر نہیں آتا، کیا ہوئے؟“ دُرگاکے معصومانہ انداز سے دیکھ کر کہا، ”بھورا بھی بجا گیا ہوں تو ام جوں کے توں تھے۔ اتنی دیر میں کوئی

توڑے گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔

سرفان علی۔ تمہارا کس پر شبہ ہے؟

مالی۔ بھروسہ اب میں کیسے بتاؤں؟ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ نہ جانے کس کی نیت بگڑی ہو۔

سرفان علی۔ مگر میرا شبہ تمہارے ہی اوپر ہے۔ اگر توڑ کر رکھے ہوں تو لا کر دے دو۔ یا صاف صاف کہہ دو۔ کہ میں نے توڑے ہیں۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔

چور خض سزا سے نہیں بچنا چاہتا۔ وہ بدنامی سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ وہ سزا سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا بدنامی سے۔ جب اسے سزا سے بچنے کی ساری امید منقطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا۔ دُرگا اس وقت اپنے فعل کا اعتراف کر کے سزا سے بچ سکتا تھا۔ پر اس نے کہا، بھروسہ مالک ہیں جو چاہیں کریں۔ میں نے آم نہیں توڑے۔ سرکار ہی بتا دیں۔ کہ اتنے دن آپ کی تابعداری کرتے ہو کُنئے۔ کبھی ایک ٹہنی بھی چھوئی ہے؟

سرفان علی۔ تم قسم کھا سکتے ہو؟

دُرگا۔ بھروسہ گنگا کی قسم جو میں نے آسمان میں ہاتھ بھی لگایا ہو۔

سرفان علی۔ اس قسم کی سزا نہیں۔ تم لوٹے میں پانی لاؤ۔ اس میں تلسی کے پتے رکھو۔ اور تب قسم کھا کر کہو۔ کہ اگر میں نے آم توڑے ہوں۔ تو میرا لڑکا میرے کام نہ آئے تب مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہو گا۔

دُرگا۔ بھروسہ سچ کو آج کیا۔ جیسے کہنے قسم کھا جاؤں۔ جب میں نے کام ہی

نہیں کیا۔ تب مجھ پر قسم کیا پڑے گی؟

سرفان علی - باتیں نہ بناؤ، جا کر پانی لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب قیام متناس آدمی تھے۔ رات دن مجرموں سے سابقہ رہتا تھا درگا اگرچہ زبان سے دلیرانہ باتیں کر رہا تھا۔ پراس کے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھوٹے میں آیا۔ لیکن ٹوٹے میں پانی نے کر پھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ ہتھرتھرانے لگے۔ بکئی ایسے واقعے یاد آئے۔ جب کہ جھوٹی گنگا اٹھانے والوں پر آسمانی بلائیں نازل ہو گئی تھیں۔ بھگوان کے حاضر و ناظر ہونے کا ایسا یقین آج تک اُسے نہ ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میں جھوٹی گنگا نہ اٹھاؤں گا۔ یہی ہو گا۔ ناکہ برخاست ہو جاؤں گا۔ کچھ جرم مان ہو جائے گا۔ یہ منظور ہے۔ نوکری بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ اور نوکری نہ بھی ملے تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی ہے۔ کدال بھی چلاؤں گا۔ تو چار پانچ آنے روز پانچ جاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ خالی ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے سامنے آکھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے سنا بچہ میں کہا "پانی لاؤ"

دُرگا۔ بچہ میں گنگا نہ اٹھاؤں گا۔

ڈاکٹر۔ تو ثابت ہو گیا، کہ تم نے ضرور آم توڑے۔

دُرگا۔ اب سرکار جو چاہیں سمجھیں۔ مان لیجیے میں نے ہی توڑی یہ تو آپ کا غلام

ہوں۔ رات دن تابعداری کرتا ہوں۔ بال بچے آدموں کے لیے روئیں تو کہاں جاؤں۔

اب کے جان بکسی کی جائے۔ پھر ایسی کھتا نہ ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب اتنے فیاض نہ تھے۔ انہوں نے یہی احسان کیا۔ کہ دُرگا کو پولیس کے

سیر نہ کیا اور نہ اسے ہنٹر لگائے، اس کے مذہبی اعتقاد نے انہیں کچھ نرمی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ مگر ایسے بد نیت شخص کو اپنے یہاں رکھنا غیر ممکن تھا۔ انہوں نے دم درگا کو معزول کر دیا۔ اور اس کی باقی تنخواہ جرمانہ میں ضبط کر لی۔

(۳۱)

کئی ماہ گزرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر سرفراز علی مسٹر پریم شنکر کے بائیچہ کی سیر کرنے گئے۔ وہاں سے چند اچھی اچھی فلمیں لانے کا ارادہ تھا۔ پریم شنکر کو بھی بائانی کا شوق تھا اور دونوں آدمیوں کے درمیان یہی ایک مناسبت تھی۔ ورنہ دونوں بالکل متضاد تھے۔ پریم شنکر قناعت پسند، سادہ مزاج، غریب دوست آدمی تھے۔ وہ کئی سال امریکہ میں رہ چکے تھے۔ وہاں زراعت اور فلاحیت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب یہاں آکر اسی فن کو ذریعہ معاش بنالیا تھا۔ انسانی خاصہ اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق ان کے عجیب خیالات تھے۔ جن کے باعث شہر کے ہمدرد طبقہ کے لوگ انہیں مرقی فاتر العقل سمجھتے تھے ان کے خیالات سے لوگوں کو ایک قسم کی فلسفیانہ ہمدردی ضرور تھی۔ مگر اس میں لوگوں کو شک تھا۔ کہ ان پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے، یہ عمل کی دنیا ہے۔ فلسفہ کی دنیا نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ ہمیشہ فلسفہ ہی رہے گا۔ اسے واقعات زندگی سے کوئی علاوہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بائیچہ میں داخل ہوئے تو پریم کو کیا ریاں سمجھتے ہوئے پایا۔ کنویں پر ایک سفید پوش آدمی کھڑا پمپ سے پانی نکال رہا تھا۔ وہ درگامالی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس وقت درگا کی جانب سے بغض اللہ سا پیدا ہوا۔ جس شخص کو انہوں نے سزا دے کر اپنے یہاں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اسے اس قدر خوش باش ہونے کا کیا حق تھا۔ اگر درگا اس وقت پچھٹے حال، رونی صورت بنائے نظر آتا۔ اور انہیں دیکھتے ہی ان کے سامنے

ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اس پر رحم آ جاتا وہ اسے غالباً کچھ انعام دیتے اور پریم شنکر سے اس کی نسبت چند کلمات خیر کہنے کی تکلیف گوارا کرتے وہ خاصۃً نیک آدمی تھے۔ اور اپنے ملازموں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر ان کی اس مہربانی اور اس التفات میں مطلق فرق نہ تھا جو انہیں کتوں یا گھوڑوں کے ساتھ تھی۔ اس مہربانی کی بنیاد انصاف پر نہیں جسم پر تھی۔ درگاہ انہیں دیکھا۔ کنوئیں پر کھڑے کھڑے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی یہ خود داری ڈاکٹر صاحب کے جگر میں کانٹے کی طرح چبھی۔ انہیں اس خیال سے غصہ آیا کہ میرے یہاں سے نکلتا اس کے حق میں اکبر ہو گیا۔ پریم شنکر جو ان ہی ان سے مصافحہ کر کے نہیں چند نئے تختوں کی طرف لے چلے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ”یہ آدمی آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ہے؟“

پریم شنکر۔ چار پانچ ہفتے ہوئے ہوں گے۔

سرفراز علی۔ کچھ نوچ کھسوط تو نہیں کرتا۔ اس سے پہلے یہ میرے یہاں مالی تھا۔

اس کی دست درازیوں سے تنگ آ کر میں نے اُسے نکال دیا تھا۔ کبھی پھول توڑ کر بیچ لیتا۔ اور کبھی پودے اکھاڑ کر لے جاتا اور پھولوں کا نوڑ کر ہی کیا۔ ایک بار میں نے چند اجاب کی دعوت کی تھی۔ ملیج آبادی سفیدہ خوب پھلا ہوا تھا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور میں درخت کے پاس گیا تو سارے پھل غائب کچھ نہ پوچھے، اس وقت کتنی خفت ہوئی۔ میں نے اسی وقت ان حضرات کو دھتکار بتائی۔ بڑا ہی دغا باز بد نیت آدمی ہے۔ اور ایسا شاطر۔ کہ اسے گرفتار کرنا محال ہے۔ کوئی وکیل ہی جیسا کہ کیا آدمی ہو تو اسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسی صفائی اور دلیری سے انکار کرنا ہے کہ اس کا منہ

تکتے رہ جائیے، آپ کو تو کبھی چرکا نہیں دیا؟  
 پیریم شنکر۔ جی مطلق نہیں، مجھے اس نے شکایت کا کبھی موقعہ نہیں دیا۔ یہاں تو  
 خوب محنت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کی چٹھی میں بھی آرام نہیں کرتا مجھے تو اس پر اتنا  
 بھروسہ ہو گیا ہے کہ سبزی، پھل، پودے و سب سب اسی کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے  
 ہیں۔ دن بھر کو آمدنی ہوتی ہے۔ وہ شام کو مجھے دے دیتا ہے۔ اور کبھی ایک پانی کا  
 بھی فرق نہیں ہوتا۔

سرفان علی۔ جناب یہی تو اس کی منشا کی تعریف ہے کہ آپ کو اٹلے سترے سے  
 منڈے اور آپ کو خبر نہ ہو، آپ اسے کیا تنخواہ دیتے ہیں۔

پیریم شنکر۔ یہاں کسی کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ سب آدمی نفع میں برابر شریک ہوتے  
 ہیں۔ ہمدیہ میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ اس پر دس  
 فیصدی کا خیر کے لیے الگ کر لیا جاتا ہے۔ باقی روپے بلا تقسیم کر دیئے جاتے ہیں پچھلے  
 ماہ ہم روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ مجھے ملا کر کل سات آدمی ہیں، ہر ایک کے حصہ میں  
 بیس بیس روپے آئے تھے۔ اب کی ماہ میں جوار ہو گئی ہے۔ اس درداچھے آئے ہیں۔  
 زیادہ آمدنی کی امید ہے۔

سرفان علی نے تعجب سے پوچھا۔ کیا آپ اس قدر قلیل آمدنی پر بسر کر لیتے ہیں؟  
 پیریم شنکر۔ جی ہاں بہت آسانی سے۔ میں ان مصنوعی ضروریات کا پابند نہیں ہوں  
 جسے آج کل داخل ہندیب سمجھا جاتا ہے۔ میں وہی کپڑے پہنتا ہوں، وہی کھانا  
 کھاتا ہوں۔ اور اسی طرح رہتا ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہی کیوں ہو؟ دس بیس روپے  
 ماہوار ادویات کا صرفہ ہے جو غریب کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ رقم مشترکہ آمدنی سے وضع



کی جاتی ہے۔ اور سب کے سب آدمی اس ثواب میں شریک ہوتے ہیں۔ سائیکل چوآپ کو نظر آرہی ہے وہ مشترک رقم سے لی گئی ہے۔ جسے ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر سوار ہوتا ہے۔ چونکہ ان آدمیوں کو مجھ پر زیادہ اعتبار ہے۔ اس لیے وہ مجھے اپنا کھینچا سمجھتے ہیں۔ اور میرے علم و تجربہ کے باعث میرا دباؤ مانتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا نوکر ہوں۔ سب کے سب سا جیسے دار ہیں۔ اس لیے سب جان توڑ کر محنت کرتے ہیں۔ اور کامل ایمانداری کے ساتھ جب ایک شخص مالک اور دوسرا اس کا نوکر ہوتا ہے۔ تو فوراً رقابت شروع ہو جاتی ہے۔ مالک چاہتا ہے کہ میں اس محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کروں۔ نوکر چاہتا ہے کہ میں کم سے کم کام کروں۔ ان کے درمیان ذرا بھی ہمدردی یا برادرانہ اعلق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس رقیبانہ کشمکش کا نتیجہ بڑا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا میں دولت اور افلاس کے دو جواہر افرقے میں۔ اور ان میں خوریز جنگ ہو رہی ہے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رقابت کا دوا اب نزہت کی حالت میں ہے۔ اس کا جگہ اب باہمی امداد اور ہمدردی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ میں نے دوسرے ملکوں میں رقابت کے نظارے خوب دیکھے ہیں اور ان سے سیر ہو گیا۔ باہمی امداد میں نجات کی صورت نظر آتی ہے۔ اب ہمیں زبردستی کو خیر باد کہہ کر ایثار سے کام لینا پڑے گا۔

سکرٹان علی۔ تو یہ کہنے کے آپ، سوشلسٹ ہیں۔

پیریم شکر جی نہیں میں سوشلسٹ یا ٹیڈا کر بیٹھ کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف حق اور انصاف کا خادم ہوں۔ میں انقلاب کو علم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ علم اور ذہانت

فہم و فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زہر پرستی کا غلام نہیں بنانا  
 چاہتا۔ مجھے موجودہ تعلیم اور تہذیب پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔ علم کا کام ہے۔ تہذیب  
 اخلاق اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی، فراخ دلی، ایثار، بے نفسی، ہمدردی، غریب  
 دوستی، اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں شہرت و جاہ کا غلام بنادے جو ہمیں  
 زیر دست آزاد می پر مائل کرے۔ جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فریب ہونے کی تحریک  
 دے۔ تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلاء و محسن و طمع کے بس ہو جائیں۔ تو قابلِ معافی ہیں۔  
 مگر مدعیانِ علم و تہذیب کے لیے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے۔ علم و فضیلت کو  
 ہم نے بامِ شہرت کا زینہ بنالیا۔ حالانکہ وہ خدمت کا وسیلہ تھا۔ اونچی سے اونچی تعلیم  
 پائے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ حریفانِ نظر آتے ہیں۔ بس زبردستی ہماری تعلیم و  
 تہذیب کا معیار ہے۔ میں اس تعلیم سے چپالت کو بدتر جہا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہمارے  
 پرنسپل صاحب ایک ہزار سے کم تنخواہ پائیں، تو ان کا منہ نہیں سیدھا ہوتا۔ ہمارے  
 دیوانی اور والی کے حکام و دہزار ماہوار تنخواہ پانے پر بھی شکوہ اُٹھ کر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر  
 صاحب چلتے ہیں کہ ساری دنیا میں لیٹن ہو جائے۔ اور میں سونے کی دیوار کھڑی کر لوں۔  
 اور ہمارے وکیل صاحب (معاف کیجئے گا) اپنی قانون دان کو ہیرے کے تول پہنا جاتے  
 ہیں۔ سب کے سب وقت، دولت ہے، کے ٹکے کے غلام بنے بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے ہر  
 ایک سیکڑوں، ہزاروں آدمیوں کی روزی و فہم کر لیتا ہے۔ اور پھر بھی خادمِ قوم بننے  
 کا دعویٰ کرتا ہے۔ رعایا نافرمانی کر رہے ہیں، طاعون سے مر رہے ہیں، ہمارا دماغی  
 گردہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ پیدا دوسرے کریں کھانا ہمارا کام ہے۔ میں اس گردہ کو  
 محض وجود معطل نہیں بلکہ شہر دائر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان علی نے بہت تحمل سے کام لے کر پوچھا: ”تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم سب مزدوری کریں؟“

پیریم فنکٹر - جی نہیں، اگر ایسا ہو تو میں اسے نوعِ انسان کے لیے مایہ خیر و برکت سمجھوں۔ مجھے صرف حالات میں اس درجہ تفاوت سے اعتراض ہے۔ اگر ایک غریب آدمی پانچ روپے ماہوار میں گزار سکتا ہے تو ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے لیے اس کی دگنی چوگنی رقم کافی ہونی چاہیے۔ مگر پانچ اور پانچ ہزار، پچاس اور پچاس ہزار کا بعد المشتقین کیوں ہو؟ انتظامِ سلطنت قانونی فیصلہ، قانون کی حمایت طبابت، تصویر کشی، رقاصہ معلی، دلالی، تجارت اور صد ہا دیگر پیشے ایسے ہیں جن میں ایک بھی کسبِ دولت نہیں کرتا۔ ان سب کا مدار دوسروں کی کمائی پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیشے جو ضروریاتِ زندگی پیدا کریں۔ قیامِ حیات کے لیے سامانِ ہم پہنچائیں۔ آج دنیا کے سارے مدبر، سارے وکیل، سارے دلال، سارے پروفیسر معرضِ فنا میں آجائیں۔ تو دنیا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرائے گی۔ بلکہ خوشی سے گھی کے چراغ جلانے لگی۔ اس کے سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا، کاشت کار اپنا ہل چلانے لگا۔ اور اپنے گوشہٴ تناسل اور عافیت میں بیٹھا ہوا آرام سے زندگی بسر کرے گا۔ آپ فرمائیں گے۔ یہ تو تمدن کے دورِ اولین کا نقشہ ہے۔ انسان نے قرونِ ادرصدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ ان کو ہٹا کر پھر اسی دورِ وحش کی طرف واپس جاتا ہے۔ آپ فنونِ لطیفہ کی ترقی کو انسان کے جذباتی اور روحانی عروج کا لازمہ قرار دیں گے۔ علیٰ ہذا آپ کو موجودہ تہذیب کا ہر ایک پہلو حیاتِ انسانی کے لیے ضروری نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان محض چوپایہ نہیں ہے۔ لیکن حتیٰ یہ ہے کہ تہذیب اور ترقی خود غرضی

اور جفا شکاری کی ایک مستور سورت ہے اور کچھ نہیں ہے۔ ہندوستان کا کاشتکار چین کے مزارع سے لڑنے نہیں جاتا۔ اسی تعلیم یافتہ گروہ نے اپنے مطلب کے لیے قوم کا سوانگ کھڑا کیا۔ قومی حقوق کی حفاظت کے لیے فوجیں بنائیں۔ انصاف سلطنت کا نقشہ کھینچا۔ مسائل بین الاقوام کی ایجاد، تجارت اور صنعت کے لائیکل عقدے اختراع کیے۔ اور اب اپنی فتوحات پر ناز کرتا ہے۔ اپنی تہذیب پر پھولا نہیں سماتا۔

عرفان علی۔ آپ اقتصادیات کے مسئلہ پر تقسیم محنت کو بالکل نظر انداز کر رہے قدرت نے افراد کو خاص خاص قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے بہترین استعمال کے لیے خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پیریم شنکر۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہر فرد مزدوری کرنے پر مجبور ہو نہیں جیسے ہر مانتا نے غور و فکر کی قوت عطا کی ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق کرے، جس کے جذبات مضبوط اور عمیق ہوں۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے۔ علی ہذا میری دلیل صرف یہ ہے کہ پیشوں میں اس قدر امتیاز نہ رہنا چاہیے۔ دماغ سے تعلیم و تہذیب اور درس و تدریس کا کام لینا چاہیے۔ جذبات سے روحانی اور اخلاقی اصلاح کا۔ مگر ان دماغی یا روحانی کمالات کو ذریعہ ثروت نہ بنانا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں سے کسب معاش کرے۔ اور دل و دماغ صرف قوم کی اصلاح و فلاح، روحانی مسائل کی تحقیق و تدقیق، علمی معلومات کی اشاعت اور ترویج کے لیے وقف ہوں۔ لیکن تا وقتیکہ ہم اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم کو ذہنی اور حرفتی پیشوں میں اس غیر فطری امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ آئین قدرت کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے کہ لازمی پیشوں کو تفوق ہو۔ بعض اہل اثر

کا خیال ہے کہ اس تسویہ سے اہل کمال بد دل ہو جائیں گے۔ اور دنیا بان کے انوار فیض سے محروم ہو جائے گی۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حکماء، بڑے سے بڑے شعراء، بڑے سے بڑے موجد، بڑے سے بڑے ارباب فنون لطیفہ مال و زر سے بے نیاز تھے۔ اس وقت کمال کا معادہ اپنے قلب کی تسکیں تھی۔ نوع کی ضرورت محرک کہاں تھی، جب سے کمال نے دولت کا دامن پکڑا۔ اسی وقت سے تہذیب کا انحطاط شروع ہوا۔

ڈاکٹر عرفان علی اب زیادہ صبر نہ کر سکے۔ بولے ”آپ کا مجتہد نظام معاشرت فرشتوں کی دنیا کے لیے چاہے موزوں ہو۔ لیکن اس عملی دنیا کے لیے اور اس عملی دور میں ہرگز موزوں نہیں ہے۔“

پریم شنکر محض اسی لیے کہ ابھی تک سرمایہ داروں کا اور ہندو جماعت کا عوام پر اقتدار ہے؟ مگر اس کے قبل بھی بار بار اس اقتدار کو زک ہو چکی ہے اور قرآن بتا رہے ہیں کہ زمانہ قریب میں اب اسے پھر زک پہنچنے والی ہے۔ شاید اب کے یہ شکست فیصلہ کن ہوگی۔ تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہوا کہ جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت روسا کا اقتدار، سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اور اپنی آخری منزل تک آ پہنچا ہے مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر غمور ہیں کہ ہم کو اتنا روبرو آن بالکل نہیں آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں۔ گویا عالم خواب میں ہوں۔ ہم اپنی یونیورسٹی ایجوکیشن۔ اپنے قانونی انہماک، اپنے ڈراما اور تھیٹر، اپنے نمل اور کارخانوں اور اسی

قسم کے دوسرے متاغل میں محو ہیں۔ جس کا انتشار دوسروں کی کمائی اور مستفقت پر موٹا ہونا ہے۔ موجودہ گرائی ضروریات پر سارے عالم میں داویلچا ہوا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اب ہند دنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیٹر کا وہ ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کرتا ہے۔ معاشرت کا ضروری جزو ہے۔ یا وہ غریب کندہ نائراش کاشت کار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈرگامالی ایک ڈالی میں کچھ پھل، چند جوار کی بالیں۔ چند آم سجا کر لایا۔ اس کے اندازہ اور بسترہ سے ایک خود دار نہ متانت برس رہی تھی۔ گویا اب وہ ذاتی اہمیت سے باخبر ہو گیا ہے۔ وہ سلام کر کے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ”آپ کو کن چیزوں کی قلمیں چاہئیں۔ آپ بالوجہ کو آرڈر دیکھیے۔ میں کل آپ کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ بال بچے تو اچھی طرح ہیں؟“

عرفان علی نے کسی قدر مجرب ہو کر کہا۔ ”ماں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ تم یہاں آرام سے ہو؟“  
 ”ڈرگما۔ جی ہاں۔ سب حضور کی ہربانی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ پر چند قلموں کے نام لکھ کر رکھ دیئے۔ اور رخصت مانگی۔ پیریم شکران کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب دروازہ پر متانت سے مسکرا کر کہا۔ ”حضرت میں آپ کے اصولوں کا قائل تو نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ایک کینہ اور شیطان آدمی کو انسانی بنادیا۔ یہ آپ کی صحبت کا فیض ہے میں ذات کا قائل ہوں۔ انٹی ٹیوشنوں کا قائل نہیں۔ لیکن معاف فرمائیے گا۔ میں پھر بھی کہوں گا کہ اس سے ہوشیار رہیے گا۔ ایجوکیشن کا علم ابھی تک کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کر سکا۔ جو تنم کی تاثیر کو مٹا دے۔“

# آتمارام

(۱)

موضع بنیدو میں مہادیو سنا ایک نمایاں وجود تھا۔ وہ اپنے کپھریل کے بوسیدہ سائبان میں انگلیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوا صبح سے پہر رات ہتھوڑا لیے کھٹ کھٹ کیا کرتا تھا۔ اس صدائے پیہم کے لوگ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جب کسی وجہ سے یہ آوازیں بند ہو جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی پتھر غائب ہو گئی ہے۔ وہ روز ایک بار صبح کو اپنے ٹوٹے کا پنجرہ لیے کوئی بھجن گانا ہوا تالاب کی طرف جانا تھا۔ اس وقت اندھیرے میں اس کی جھکی ہوئی کمر اور اس کا جسم نحیف دیکھ کر کسی اجنبی شخص کو اس پر شیطانی وجود کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ اس کے یہ بھجن تعین وقت کے اعتبار سے صدائے مرنے کا کام دیتے تھے۔

جوں ہی کانوں میں آواز آتی۔ "ست گردت شودت داتا" لوگ سمجھ جاتے کہ سویرا ہو گیا۔ اس کی ہی حرکت اس کے تکمیل اعضاء کا ثبوت تھی۔ درنہ طلوع سحر کے بعد پھر اسے ایک مختصر کبست خیال کرنے میں اگر کوئی امر مانع تھا تو یہ وہی ست گردت کا کلمہ دھرت تھا۔ جس سے وہ اپنے طوطے کو عبادت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ فی الواقع ہمدیو بے کار سہتی کا ایک نادر محبتہ تھا۔ جو شکستوں اور ناکامیوں سے پیچھے رہنمائی اور چرکوں سے بے پردا۔ ابھی تک شمشیر بکف میدان میں مردانہ وار کھڑا تھا جو اس کا بیسہ منتشر دانتوں کا دستہ بامال کمر کا میمنہ متزلزل۔ خونِ قلب پریشان ہو چکا تھا۔ مگر سہمت وہی تھی، استقلال وہی، جس پر شباب کو رشک ہو سکتا تھا۔

ہمدیو خوش نصیب بھی تھا اور کم نصیب بھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اس کے تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں تھیں اور بہوؤں کے لڑکے تھے۔ لڑکے کہتے اچی جب تک دادا اچیتے ہیں تب تک تو زندگی کا لطف اٹھالیں۔ پھر تو یہ ڈھول گلے پڑے ہی گئی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اپنے باپ کی کچھ مدد کرتے۔ لیکن چونکہ ہمدیو اپنے بزرگانہ اختیارات سے مستعفی نہ ہوتا تھا۔ اس لیے لڑکے اس کی ذمہ داریوں میں خلل ہونے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے اور اس لازم و ملزوم کی چکی میں پڑا ہوا وہ نیم جان خستہ حال بڈھا پساجاتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ



انقضاء عمر کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی نسبت معکوس تھی۔ دائرہ کفالت روز بروز وسیع اور وسائل معاش روز بروز تنگ ہوتے جاتے۔ پہلے کوزہ کا ذوق ہمدلیو کی ذات تک محدود تھا۔ پر اب سعادت مند بیٹے بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے لگے تھے۔ ہمدلیو کو ساقی اور بسا اوقات ساقی ناکام کا پارٹ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بیٹے اس وقت بھد بات حریت اور مساوات کے ایسے پُر شور مناظرے کرتے کہ کبھی کبھی یہ بھوش فرزند نہ سعادت مندی پر بھی غالب آجاتا تھا اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ ماکولات کی مساوی مقدار ان کی تسکین قلب کے لیے نہ پہنچ جاتی۔ بیچارہ ہمدلیو کبھی کبھی اس شور قیامت سے تنگ آکر بھوکا اٹھ آتا اور اپنے غمگسار حقے کا نیمہ شرابیں سنتا سنتا سو جاتا۔ افسوس یہی ہے کہ باہر بھی اُسے ان باغیانہ مناظروں سے نجات نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ اپنے فن میں بیگانہ روزگار تھا۔ ان کی گھٹا آوروں سے کہیں زیادہ دیراثر تھی۔ اس کی صفائی کہیں زیادہ وقت طلب اور اُس کے کیمیائی عمل کہیں زیادہ قوی تاثیر۔ تاہم اُسے بے صبر اور وہمی اشخاص کی بدزبانیوں کا آٹے دن نشانہ بننا پڑتا تھا۔ پر ہمدلیو عائدانہ توکل کے ساتھ سر جھکاٹے ہوئے چاروں طرف کی بوجھتا رہی سہا کرتا۔ اس کے کان روزانہ نعرین اور دشنام کھن و تشنیع کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اسے اب ان کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ بھول ہی یہ طوقان فرو ہوتا۔ وہ اپنے

ٹوٹے کی طرف دیکھ کر پکارا اٹھتا "ست گردت شیودت دانا"۔  
 اس اسم اعظم کا ورد اس کی تشفی کامل کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ یہ جھونکے  
 اس کی زندگی کے ایک جزو لازم بن گئے تھے۔ ان سے اس کے سکون  
 میں مطلق فرق نہ پڑتا تھا۔

(۲)

ایک روز اتفاق سے کسی لڑکے نے پنجرے کا دروازہ کھول  
 دیا۔ ٹوٹا اُڑ گیا۔ مہادیو نے سراٹھا کر پنجرے کی طرف دیکھا اور  
 اس کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ اس! ٹوٹا کہاں گیا! اُس نے پھر پنجرے  
 کی طرف دیکھا۔ ٹوٹا غائب تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور ادھر ادھر کھیر پیل  
 پر نظر دوڑاتے لگا۔ اُسے دنیا میں اگر کوئی چیز پیاری تھی تو یہ ٹوٹا تھا۔  
 لڑکے بالوں۔ ناتی پوتوں سے اس کی طبیعت آسودہ ہو گئی تھی۔  
 وہ کبھی کسی بچہ کو گود میں نہ لیتا۔ بچوں کی شرارت سے اس کے کام  
 میں ہرج ہو جاتا تھا۔ کوئی مہتوڑا چھین لیتا۔ کوئی سفسی اُٹھا لیتا۔  
 اس لیے وہ اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا تھا۔ بیٹوں سے اُسے مطلق انس  
 نہ تھا۔ نہ اس لیے کہ وہ کاہل و بھود تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے شریک  
 کوزہ ہو جاتے تھے۔ محلہ کے آدمیوں سے اُسے چڑھتی۔ اس لیے کہ وہ  
 اس کی بھٹی سے آگ نکال لے جاتے تھے۔ اس تمام مجمع شر سے اس  
 کے لیے کوئی پناہ تھی تو وہ ہی ٹوٹا تھا جس کی ذات سے اسے کوئی  
 تکلیف، کوئی الجھن کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اب زندگی کی اس

منزل پر پہنچ گیا تھا۔ جب انسان کی نگاہوں میں عافیت کی۔ گوشہ امن کی وقعت دنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ طوطا ایک کھیریل پر بیٹھا تھا۔ ہادیو نے پنجرہ اتار لیا اور اسے دکھا کر کہنے لگا۔ ”آ۔ آ۔ ست گردت۔ شیودت دانا۔ آ۔ آ۔“ لیکن گاؤں اور گھر کے کئی لڑکے جمع ہو کر چلائے اور نالیاں بجانے لگے۔ اوپر سے کوؤں نے کائیں کائیں شروع کی۔ طوطا اڑا۔ اور گاؤں سے باہر نکل کر ایک درخت پر جا بیٹھا۔ ہادیو بھی خالی پنجرہ لیے اس کی طرف دوڑا۔ ہاں دوڑا! لوگ اس کی تیز گامی پر غش غش کرتے تھے ہوس کی اس سے بہتر اس سے جامع اس سے زندہ تصویر شاید کسی مصور کے خیال میں نہیں آسکتی۔ پشت دوتا اور سرعت گام میں کوئی نفاق نہیں ہے۔ اس کی تصدیق ہو گئی۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کسان پر چھوڑ چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ اس موقعہ تفریح کو کبوں ہاتھ سے جانے دیئے۔ ہادیو کی دل آزاری میں ہر شخص کو مزہ آتا تھا۔ بالخصوص اس کی نگاہوں پر خرم کا نظارہ نہایت فرحت انگیز تھا۔ لوگوں نے کنکر پھینکے۔ تالیاں بجائیں۔ طوطا پھر اڑا اور اس درخت سے دور۔ آ۔ آ۔ آ۔ کے گھنے باغ میں ایک درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ ہادیو پھر خالی پنجرہ لیے آ۔ آ۔ آ۔ کا تالو کی طرف ٹٹکی لگائے مینڈک کی طرح اُچکتا ہوا چلا۔ کسانوں کا غول بھی مہم مہم جاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر اس کی سرگرمی طلب ان کے شوق تفریح پر غالب آئی۔ جب

وہ اس گھنے باغ میں پہنچا تو اکیلا تھا۔ اُس نے سایہ میں ذرا دم لیا۔  
 پتھر کے تلووں سے آگ نکلی رہی تھی۔ جب ہوش بجا ہوئے تو اس  
 نے پھر پنجر اُٹھایا اور پھر کہنے لگا "ست گزوت شیودت داتا۔ آ۔ آ۔"  
 طوطا بھنگی سے اتر کر نیچے کی ایک شاخ پر آ بیٹھا۔ مگر مہادیو کی  
 طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر پھر اُڑا اور دوسری شاخ پر جا بیٹھا  
 مہادیو نے سمجھا مجھ سے ڈر رہا ہے۔ وہ پنجرے کو چھوڑ کر آپ ایک  
 دوسرے درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ طوطے نے چاروں طرف غور  
 سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اُترا اور  
 آکر پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا۔ مہادیو کا کلیجہ اُچھلنے لگا۔ ست گزوت  
 شیودت کا درد کرتا ہوا آہستہ آہستہ طوطے کے قریب آیا اور تب  
 ایک جھست مار کر لپکا کہ طوطے کو پکڑ لے مگر طوطا ماتھ نہ آیا۔ پھر اُڑ کر  
 درخت پر جا پہنچا۔

شام تک یہی کیفیت رہی۔ طوطا کبھی اس شاخ پر جاتا۔ کبھی اُس  
 شاخ پر۔ کبھی پنجرے پر آتا۔ کبھی پنجرے کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے  
 دانہ پانی کی پیالیوں کو دیکھتا مگر جو نہی مہادیو اس کی طرف آتا۔ وہ پھر  
 اُڑ جاتا۔ بڈھا اگر پکیر ہوس تھا تو طوطا طائر آرزو۔ یہاں تک کہ شام  
 سیاہ نے ہوس اور آرزو کی اس کشمکش پر پردہ ڈال دیا۔

(۳)

رات ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ طوطا معلوم نہیں

تپوں میں کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ ہمارے خوب جانتا تھا کہ رات کو کہیں  
 طوطا اڑ کر نہیں جاسکتا اور نہ پیچھے میں آسکتا ہے۔ تاہم وہ اس  
 درخت کے نیچے سر جھکاٹے پیچھے کو پہلو میں رکھے بیٹھا ہوا تھا۔  
 آج اس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ رات کے کھانے کا وقت بھی نکل  
 گیا۔ ایک بوند پانی بھی اس کے حلق میں نہیں گئی۔ لیکن اُسے نہ بھوک  
 تھی نہ پیاس۔ طوطے کے بغیر اسے اپنی زندگی ویران۔ خشک و شوار  
 معلوم ہوتی تھی۔ وہ شب و روز مشقت کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ اس  
 کی تحریک طبعی تھی۔ زندگی کے اور سب کام اس لیے کرتا تھا کہ اس  
 کی عادت تھی۔ ان کاموں میں اُسے حیات کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔  
 طوطا ہی ایک ایسی چیز تھا۔ جو اُسے اس کی حیات کی یاد دلانا تھا۔  
 عملاً وہ ایک مردہ وجود تھا۔ کوئی شوق نہیں۔ کوئی آرزو نہیں۔ کوئی فکر  
 نہیں۔ کوئی ہوس نہیں۔ اس حیاتِ مطلق میں ہی طائرِ خوش رنگ و  
 خوش نوا اُسے علائقِ زیست کی خبر دیتا تھا۔ اس تاریکی میں بھی ایک  
 روشنی تھی۔ اس سناٹے میں بھی ایک صدا۔ اس کا ہاتھ سے جانا اپنے  
 وجود سے پیچھے ہونا تھا۔

ہمارے دل بھر کا بھوکا پیاسا تھا کا ماندہ رہ رہ کر جھپکیاں لے لیتا  
 تھا مگر ذرا ہی دیر میں وہ چونک کر بھر آنکھیں کھول دیتا اور اس فضا  
 تاریک میں اس کی آواز سنائی دیتی: ”ست گردت شیوت داتا!“  
 اُدھی رات گزر گئی تھی۔ یکبارگی وہ کوئی آہٹ پا کر چونکا۔ تو دیکھا۔

کہ ایک دوسرے درخت کے نیچے ایک دھندلا سا چراغ جل رہا ہے اور کئی آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ وہ سب شاید حلیم پی رہے تھے۔ تمنا کو کی ہبک نے مہادیو کو بتایا کر دیا۔ بلند آواز سے بولا۔ ”ست گردت شیودت داتا“ اور ان آدمیوں کی طرف چلا۔ مگر حسن طرح بندوق کی آواز سنتے ہی ہرن بھاگ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب کے سب اٹھ کر بھاگے۔ کوئی ادھر گیا۔ کوئی اُدھر۔ مہادیو نے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ ٹھہرو! ٹھہرو! دفعۃً اسے خیال آگیا کہ یہ سب چور ہیں۔ وہ زور سے چلانے لگا۔ چور! چور! پکڑو۔ پکڑو! چوروں نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

مہادیو چراغ کے پاس گیا تو اسے ایک کلسا رکھا ہوا ملا۔ وہ رنگ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ مہادیو کا سینہ اچھلنے لگا۔ اس نے کلسے میں ہاتھ ڈالا تو اشرفیاں تھیں۔ اس نے ایک اشرفی بائرنکالی اور چراغ کے اچالے میں غور سے دیکھا۔ ہاں اشرفی تھی۔ اس نے کلسا اٹھا لیا۔ چراغ بجھا دیا اور درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔ مالِ حرام نے شاہ سے چور بنا دیا۔

اسے پھر اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو چور واپس آجائیں اور مجھے تنہا دیکھ کر کلسا چھپا لیں۔ اس نے کچھ کچھ اشرفیاں نکال کر کمر میں باندھیں۔ پھر ایک سوکھی لکڑی سے زمین کی مٹی ہٹا کر کئی جگہ گڑھے بنائے۔

اور انہیں اشرفیوں سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا اور حالانکہ ابھی زیادہ تعداد گلے ہی میں تھی لیکن اس کی کمر اور گر ٹھوں میں دوسو سے کم نہ تھیں۔

(۴)

ہمدیو کی نظروں کے سامنے اب ایک دوسری دنیا تھی۔ نامی روشن۔ ذمی حیات۔ نکریں۔ تمنا میں اور ارادے اُگے۔ بڑھے اور لہرائے گئے۔ افلاس کی سیاہ گھٹا پڑتی ہی بزم انجم آراستہ نظر آتی۔ حالانکہ ابھی خزانے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی تھا۔ پر نامیہ کو مقراض گلی میں کیا پروا؟ ایک نچتہ مکان بن گیا صرافہ کی ایک شاندار دکان کھل گئی۔ عزیز و بیگانہ گلو گبر سو گئے۔ بادہ گلگوں کے دور چلنے لگے۔ عیش و تکلف کے سامان فراہم ہو گئے۔ پھر تیر تھ جاترا کو پہلے اور ایسی پر فیاضانہ دعوت عام ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک شوالہ اور نچتہ کنواں تعمیر ہو گیا اور وہ روزِ شام کو بیٹھ کر وہاں کتھا پران سننے لگا۔ سادھو مفتوں کی محفل سیج گئی۔ درہ زندگی کا نقشہ مکمل ہو گیا۔ آئندہ، کاساز نغمہ زبر ہو گیا۔ دفعۃً اُسے خیالی آیا کہ کہیں چور آجائیں تو میں کسائے کر بھاگوں گا کیونکر؟ اس نے امتحاناً گلے کو بغل میں دبایا اور ایک سو قدم تک بے تحاشا درڑا ہوا چلا۔ معلوم ہونا تھا کہ اس کے پیروں میں پیر لگ گئے ہیں۔ اطمینان ہو گیا۔

انہیں منصوبوں میں رات ختم ہو گئی۔ سفید صبح نمودار ہو  
 گیا۔ سوا جاگی۔ سوئے ہوئے درخت بیدار ہوئے۔ پڑیاں  
 گانے لگیں۔ ناکاہ مہادیو کے کانوں میں آواز آئی :-  
 ست گردت شیودت داتا  
 رام کے چرن میں چت لاگا

یہ بول ہمیشہ مہادیو کے ورد زبان رہتا تھا۔ دن میں ہزاروں  
 بار یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ پران کی باطنی کیفیت  
 نے اس کے دل پر کبھی اثر نہ کیا تھا جیسے کسی بابے سے آواز نکلتی  
 ہے۔ اسی طرح یہ پلاس کی زبان سے نکلتا تھا۔ بے معنی اور بے اثر  
 اس کا دل بے برگ و بار اس ہوائے لطیف سے بے حس رہتا تھا  
 لیکن اب اس میں پیال اور کونیلین نکل آئی تھیں۔ اس ہوا سے  
 جھوم اٹھا۔ محو ترنم ہو گیا۔

ایک طرف طلوعِ سحر کی معرفت خیز تیر تھی۔ دوسری طرف  
 دریا کا روحانی نغمہ اور سطحِ آب کا عارفانہ سکون۔ فضا ئے محیط  
 ایک نورانی راگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عین اسی وقت طوطا شاخِ بلند  
 سے پروں کو جوڑے ہوئے اُترا جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے  
 اور آکر پتھرے میں بیٹھ گیا۔ مہادیو فرط مسرت سے دوڑا اور پتھرے  
 کو اٹھا کر بولا۔ "اؤ آتما رام! اب تمہیں چاندی کے پتھرے میں  
 رکھوں گا اور سونے سے مڑھ دوں گا۔" احسان اور تشکر سے اس کا



سینہ لبریز ہو گیا۔ پر ماما کتنا دیا دان ہے، کتنا بے کس نواز۔ یہ  
 اُس کی عین رحمت ہے۔ در نہ مجھ جیسا عاصی۔ سرتاپا گناہوں میں  
 ڈوبا ہوا کب اس عطا ئے بکیراں کے قابل تھا؟ ہاں یہ اس کا فضل  
 و کرم ہے۔ ان خیالات سے اس کا دل اُٹا آیا۔ اس پر ایک  
 سرور کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ایک خود مستی کے عالم میں  
 بول اٹھا :-

ست گردت شودت دانا  
 رام کے چرن میں چیت لاگا  
 اس نے ایک ہاتھ میں پتھر اٹھکایا۔ بغل میں کلسا دایا گھر چلا

(۵)

ہمارے اپنے مکان پر پہنچا تو ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ گھر کے لوگ  
 خواب سحر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ راستے میں بجز ایک کتے کے اور  
 کسی سے اس کی ٹڈ بھڑ نہ ہوئی اور کتے کو اشرفیوں سے کوئی خاص  
 رعیت نہیں ہوتی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کلسے کو ایک مٹی کی ماندی  
 چھپا دیا اور اسے کوئلہ سے اچھی طرح ڈھانک کر اس کو ٹھٹھی میں رکھ  
 دیا۔ جس میں اس کے اوزار اور نیم مرتب زیورات رکھے جاتے تھے  
 جب دردن نکل آیا تو وہ سیدھا پر و بہت جی کے مکان پر جا پہنچا  
 پر و بہت جی پوچھا پر عیضے ہوئے سے بیچ رہے تھے۔ کل ہی مقدمہ  
 کی پلشی ہے اور ابھی تک روپیہ کی کوئی تسلیل نہ کر سکا۔ کیونکہ کام

چلے گا۔ ججائوں میں کوئی سانس ہی نہیں بقیہ کہ اتنے میں جہاد یونے  
 پہنچ کر پالاگن کیا۔ پروہت جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ اپنی  
 منحوس صورت لیے کہ یہاں کیونکر آکھڑا ہوا؟ معلوم نہیں آج  
 دانہ بھی میسر ہو گا۔ یا نہیں۔ کچھ ترش ہو کر پوچھا۔ کیا ہے جی! کیا  
 کہتے ہو! کیا جاننے نہیں کہ ہم اس کمبوت پوجا پر رہتے ہیں؟ جہادیو  
 نے کہا۔ ”جہاراج آج میرے یہاں منیہ نارائن کی کنتا ہے“  
 پروہت جی متحیر ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔  
 جہادیو کے گھر کنتا کا ہونا اتنی ہی غیر معمولی بات تھی جتنی اپنے گھر سے  
 کسی نہکاری کے لیے بھیک کا نکلنا۔ پوچھا۔ ”آج کیا ہے؟“  
 جہادیو بولا۔ ”کچھ نہیں۔ ایسا ہی جی میں آیا۔ کہ آج بھگوان کی کنتا  
 سن لوں۔“

صبح ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ بینہ واد قریب دھوار کے  
 دوسرے موصوں میں نوید پھری۔ ہر کسی نے اس کی خاص و عام کی دعوت  
 نفی۔ جو سنتا تھا۔ تعجب کرتا تھا لیکن تیاریاں اتنے وسیع پیمانہ پر ہو  
 رہی تھیں کہ کسی کو شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ شام کو جب سب  
 لوگ جمع ہو گئے اور بیٹہ جی آکر سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے  
 تو جہادیو کھڑا ہو کر بلند آواز سے بولا۔ ”بھائیو! پیڑی ساری عمر بچل  
 کپٹ میں بیت گئی۔ میں نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو دکا دی۔ کتنا  
 کھرے کو کھوٹا کیا۔ یہاں تک کہ آپ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ پر اب بھگوان نے مجھ پر دیا کی ہے۔ وہ میرے منہ کے  
 کالک کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں سے للکار کر  
 کہتا ہوں کہ جس کا میرے جیسے کچھ نکلتا ہو۔ جس کی جمع میں نے مار لی ہو  
 جس کے گھنے دبا لیے ہوں۔ جس کے چوکھے مال کو کھوٹا کر دیا ہو۔ وہ  
 اپنے ایمان دھرم سے آکر مجھ سے اپنی ایک ایک کوڑی مچکا لیے اگر  
 کوئی یہاں نہ آسکا ہو تو آپ لوگ اس سے کہہ دیجئے کہ وہ کل سے  
 ایک مہینے تک جب جی چاہے آدے اور اپنا حساب چکنا کر لے۔  
 کوئی گواہی سا کھی درکار نہیں۔ بس لوگ اپنے ایمان دھرم سے جو کچھ  
 کہہ دیں گے وہ مین نکالی کر دے دل کا۔“

اس تقریر نے مجمع پر سکوت کی کیفیت طاری کر دی۔ سرگوشیاں  
 ہونے لگیں۔ کوئی پرمعنی انداز سے سر ہلا کر کہتا تھا: ”ہم کہتے نہ تھے؟“  
 کوئی محاسنہ انداز سے کہتا تھا: ”کوئی دفتینہ ہاتھ آگیا؟“ کوئی بدگمانی  
 سے کہتا تھا: ”کیا کھا کے دے گا۔ ہزاروں کا ٹوٹل ہو جائے گا؟“  
 ایک زندہ دل ٹٹا کر نے مسکرا کر ہادیو سے پوچھا: ”اور جو  
 لوگ مر گئے؟“

ہادیو نے جواب دیا: ”ان کے گھر والے تو ہونگے وہ آکر ایمان  
 دھرم سے جو کچھ نکلتا ہو لے لیں۔“  
 مگر اس وقت کسی کو وصولی کی اتنی فکر نہ تھی جتنی یہ جاننے کی کہ  
 اسے اتنے روپے مل کہاں سے گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالم سکوت

رہا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ ہر کسی کو ہمدلیو کے پاس آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ دیہات کے آدمی تھے جسے نقصان کو ایک بار پھر صبر کر چکے اس کی یاد تازہ کرنا ان کا خاصہ نہ تھا۔ پھر اکثر آدمیوں کو یاد بھی نہ تھا کہ ان کا کتنا نقصان ہوا اور ایسے بھقدس موقع پر غلط بیانی کا خوف ان کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہمدلیو کی صومنتی اور نیک نیتی نے انہیں مرعوب کر لیا تھا۔ بحر سکوت میں ایک موج بھی نہ اٹھی۔ دفعۃً پر دہشت جی بولے ”تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں ایک کنٹھا بنانے کے لیے سونا دیا تھا اور تم نے کئی ماشے تول میں اڑا دیئے تھے۔ سونا بھی خواب کر دیا تھا؟“

ہمدلیو۔ ہاں یاد ہے آپ کا کتنا نقصان ہوا ہوگا؟  
پر دہشت جی۔ پچاس روپیہ سے کم نہ ہوگا۔

ہمدلیو نے کمر سے دو اشتریاں نکالیں اور جاکر پر دہشت جی کے سامنے رکھ دیں۔

نپڈت جی کی سخت گیری پر پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ زیہ ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار روپے کا نقصان ہوا ہوگا اس کے پچاس روپیہ اینٹھ لینے۔ کچھ نارائن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ بننے کو نپڈٹ پر نیت ایسی خواب! رام رام!!

ہر ایک دل میں ہمدلیو سے وہ ہمدردی پیدا ہو گئی جو عقیدت

سے مشابہ ہوتی ہے۔ اشرافیوں کی خوش آئند آواز نے بعض کمزور  
دلوں کو گدگدایا ضرور۔ پر عام ہلار دمی اور خوف پیشانی نے اس  
گدگدہی کو سینہ ہی میں دبا دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ہر ہزاروں نفوس کے مجمع میں ایک شخص بھی  
نہ کھڑا ہوا۔ تب ہادیو نے پھر کھڑے ہو کر کہا ”معلوم ہوتا ہے آپ  
لوگ اپنا اپنا حساب بھول گئے ہیں۔ اس لیے آج کتنا ہونے دیجئے  
میں ایک جہینہ تک آپ لوگوں کی راہ دیکھیوں گا۔ اس کے بعد تیرتھ  
کرنے چلا جاؤں گا۔ آپ سب بھائیوں سے بنتی ہے کہ میرا  
ادھار کریں۔“

ہادیو کے چہرے پر ایک نیم معمولی ہلالی تھا اور اندازِ گفتگو  
میں ایک شانِ توقیر۔ کتنا شروع ہوئی اور ختم ہو گئی۔ ہادیو کی  
داد و دہش اور فیاضانہ سرگرمی نے لوگوں کی عقیدت کو احترام  
کی حد تک پہنچا دیا۔

ہادیو صبح سے شام تک اہل تقاضا کی راہ دیکھا کرتا۔ رات  
کو چوروں کے خوف سے نیند نہ آتی۔ اب وہ کام نہ کرتا۔ شراب  
کا چسکا بھی چھوٹا۔ ہال سادھو فقیر جو دروازہ پر آجاتے۔ ان  
کی خاطر خواہ تواضع و تکریم کرتا۔ قرب و جوار میں اس کے بدل و ایشاد  
کا شہرہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک جہینہ گزر گیا اور ایک داخواہ  
بھی نظر نہ آیا۔ اب ہادیو کو اندازہ ہو گیا کہ دنیا میں کتنا تنہا کتنی

پاک سمجھتی ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ دنیا بردن کے لیے بُری ہے۔ پراچھول کے لیے اچھی ہے۔

(۶)

اس واقعہ کو گزرے پچاس سال سے زائد ہو گئے۔ بنیدو میں آپ جانیے تو دور ہی سے ایک رفیع اور طلائی کنگرہ نظر آتا ہے۔ یہ ٹھا کر دوارہ کا گلس ہے۔ اس کے متصل ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے جس میں ہمیشہ کنول کھلے رہتے ہیں۔ اس کی چھلیاں کوئی نہیں بکھڑتا۔ تالاب کے کنارے ایک عالی شان مقبرہ ہے۔ یہی آتمارام کی یادگار ہے۔ اس جگہ وہ اپنے تقری پتھرے میں بیٹھے ہوئے عموں اب ہیں۔ اس کی نسبت مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے نظروں سے غائب ہو گئے۔ یہ حقیقت یہ ہے کہ بہادریو تیرتھ سے واپس آیا تو ایک دن کسی گریہ مسکین نے آتمارام کو لقمہ دہن بنا لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی آدھی رات کو تالاب کے کنارے آواز آتی ہے :-

ست گُردت شیودت داتا

رام کے چرن میں چت لاگا

بہادیو کی نسبت بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں جن میں سب سے قریب قیاس یہ ہیں کہ وہ آتمارام کے قفس عسری سے پرواز کرنے کے بعد چند سنیا سیلوں کے ساتھ بہالہ کی طرف چلے گئے۔ اور وہاں

سے والیں نہ آئے۔ ان کا نام آئنا رام مشہور ہو گیا۔  
 ابھی گاؤں میں وہ بڑھے موجود ہیں جنہوں نے فہادیو کو آخری  
 ایام میں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا چہرہ پر جلال تھا اور ان کی زبان  
 سے جو کچھ نکلتا۔ وہ ضرور پورا ہوتا تھا۔ ان کے کشف و کرامات کی  
 صد ہا داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔  
 خدا کے کتنے گنہگار بندے محض ایک صدائے غیب کی بدلت  
 محض ایک اتفاقی و بید کے اثر سے محض ایک الہامی تحریک  
 سے درجہ کمال کو پہنچ گئے۔

---

# بینک کا دیوالہ

لکھنؤ انڈسٹریل بینک کے وسیع دفتر میں لالہ سائیں داس آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے انوسٹرس ریویو کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اب کے معاملہ داروں کو منافع کہاں سے دیا جائے گا؟ چائے کو ملے یا جوٹ کے حصے خریدنے یا چاندی سونے اور روئی کا سٹک کرنے کا ارادہ کرتے۔ مگر نقصان کا اندیشہ کوئی فیصلہ قائم نہ ہونے دیتا تھا۔ غلہ کے کاروبار میں اب کے بڑا خسارہ رہا۔ حصہ داروں کی تشقی و اطمینان کے لیے فرضی حسابات تیار کرنا پڑے۔ اور منافع اصل روپیہ سے دنیا پڑا۔ اس وجہ سے پھر غلہ کے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے روح کانپتی تھی۔ مگر روپے کا بے کار رکھنا غیر ممکن تھا۔ دو ایک روز میں اس کے استعمال کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی لازمی تھی۔ کیونکہ ڈائریکٹروں کا سہ ماہی اجلاس ایک ہی ہفتہ



میں ہونے والا تھا۔ اور اگر اس وقت تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ تو پھر آئندہ تین ماہ تک کچھ نہ ہو سکے گا۔ اور ششما ہی تقسیم منافع کے موقع پر پھر وہی فرضی کاروائی کرنا پڑے گی جس کا متواتر متحمل ہونا بینک کے لیے دشوار تھا۔ بہت دیر تک اس خلیان میں بڑے رہنے کے بعد سائیں داس نے کھنٹی بجائی۔ اور نفل کے دوسرے کمرے سے ایک بنگالی بابو نے سر نکال کر جھانکا۔

سائیں داس ٹانٹا اسٹیل کمپنی کو ایک خط لکھ دیجیے کہ وہ اپنا حال کا بلیٹن شیٹ بھیج دیں۔

بابو۔ ان لوگوں کو روپیہ کا گرج نہیں۔ چھٹی کا جناب نہیں دیتا۔ سائیں داس۔ اچھا ناگیور کے سودیشی مل کو لکھئے۔

بابو۔ اس کا کاروبار اچھا نہیں ہے۔ ابھی اس کے مجوروں نے ہڑتال کیا تھا وہ ہینڈ ٹک بل بندر ہا۔

سائیں داس۔ اچی تو کہیں لکھو بھی۔ تمہارے خیال میں تو ساری دنیا بے ایمانوں سے بھری ہوئی ہے۔

بابو۔ بابا لکھئے کہ تو ہم سب جگہ لکھ دیں۔ مگر کھالی لکھ دینے سے کچھ فائدہ تو نہیں ہوتا۔

لارہ سائیں داس اپنے خاندانی رسوخ کے باعث بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ مگر کاروباری دنیا سے بہت واقفیت نہ رکھتے تھے یہی بنگالی بابو ان کے مشیر خاص تھے۔ ان بابو صاحب کو کسی کارخانہ یا کمپنی پر اعتماد نہ تھا۔ انہیں کی بزدلانہ احتیاط کے باعث پچھلے سال بینک کا روپیہ صندوق سے باہر نہ نکل

سکا تھا۔ اور اب وہی صورت درپیش تھی۔ سائیں داس کو اس مشکل سے ہمدہ برآ ہونے کی کوئی تدبیر نہ سوچتی تھی۔ اور نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی ذمہ داری پر کسی کاروبار میں بے خوف ہو کر کود پڑیں۔ پریشانی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں بیٹھنے لگے کہ دربان نے آکر خبر دی کہ ”برہل کی رانی صاحبہ کی سواری آئی ہے“

————— (۲) —————

لالہ سائیں داس چونک پڑے۔ برہل کی رانی صاحبہ کو کھنڈائے تین چار دن ہوئے تھے۔ اور ہر ایک زبان پر انہیں کے چرچے تھے کوئی ان کی سادگی اور نفاست پر قربان تھا۔ کوئی ان کے حسن صورت پر، کوئی ان کی آزاد روی پر، یہاں تک کہ ان کی کنیزیں، باڈی گارڈ، سپاہی وغیرہ بھی اس عام توجہ میں شریک تھے۔ رائل ہوٹل کے دروازے پر تماشائیوں کا ایک ہجوم سالگاہ ہوتا۔ کتنے ہی دیدہ ناز بے فکر لوگ، عطر فروش، بزاز، تبا کوگو کاروپ بھر بھر کے ان کی خدمت میں بار یاب ہو چکے تھے۔ جس طرف سے رانی صاحبہ کی سواری نکل جاتی تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو جاتے تھے۔ واللہ کیا شان ہے۔ ایسی عسارتی جوڑی لاش صاحب کے سوا اور کسی راجہ رئیس کے ہاں تو شاید ہی نکلے۔ اور کیا سجاوٹ ہے! سبحان اللہ ایسے گورے چٹے آدمی تو یہاں کبھی نظر نہیں آتے۔ یہاں تو روساں بیضہ مرغ، کشتہ شگوف اور مارا لٹم اور خدا جانے کیا کیا خاک ہلاکھاتے رہتے ہیں۔ پر کسی کے چہرے پر سرخی یا تازگی کا نام نہیں۔ یہ لوگ نہ جانے کیا کھاتے ہیں۔ اور کس کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ کہ جسے دیکھئے تازہ سیب بنا ہوا ہے۔ یہ سب آب دہوا کی برکت ہے۔

برہل شمال کی طرف نیپال کے قریب انگریزی عملداری میں ایک ریاست تھی۔ اور اگرچہ اس کے محاصل کی نسبت عوام میں مبالغہ آمیز روایتیں مشہور تھیں۔ مگر فی الواقع اس ریاست کی آمدنی دو لاکھ سالانہ سے زائد نہ تھی۔ ہاں اس کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ زمین زیادہ تر غیر آباد تھی۔ آباد حصہ بھی کوہستانی اور کم زراعت تھا۔ زمین بہت سستی اٹھتی تھی۔

لالہ سائیں داس نے فوراً لگنی سے اتار کر ریشمی سوٹ پہن لیا۔ اور میز پر آکر اس شان سے بیٹھ گئے۔ گویا راجہ رانیوں کا یہاں آنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دفتر کے کلرک بھی ہوشیار ہو گئے۔ سارے بینک میں وہ خاموش ہل چل پیدا ہو گئی۔ جو ہمیشہ غیر معمولی آمدوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ دربان نے پگڑی سنبھالی چوکیدار نے تلوار نکالی۔ اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ پنکھا تلی بھی خوابِ خرگوش سے چونکا۔ اور بنگالی بالورانی صاحبہ کی پیشوائی کے لیے دفتر سے باہر نکلے۔

سائیں داس نے بے نیازی کی شان تو بنا رکھی تھی۔ مگر دل امید و بیم سے کانپ رہا تھا۔ ایک دائی ملک سے معاملہ کرتے کا یہ پہلا سابقہ تھا۔ گھبراتے تھے کہ بات کرتے بنے یا نہ بنے۔ رئیسوں کا مزاج عرش پر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میری کون سی بات ناگوار گزرے۔ انہیں اس وقت اپنے میں ایک خامی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دالیان ملک کے آداب مجلس سے واقف نہ تھے۔ ان کی تعظیم کس انداز سے ہونی چاہیے۔ ان سے ہمکلام ہونے میں کس قسم کا لحاظ کرنا چاہیے۔ ان کے حفظ مراتب کے لیے کس حد تک انکسار مناسب ہے۔ اس قسم کے سوالات انہیں سخت تشویش ہو رہی تھی۔ ادبچی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس امتحان سے جلد نجات ہو

جائے۔ تاجروں اور معمولی زمینداروں یا رئیسوں سے معاملہ کرنے میں وہ بے رعایت صفائی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور تعلیمیافتہ مغز آدمیوں سے اخلاق اور شرافت کا ان موقعوں پر انہیں کسی مزید احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس وقت انہیں وہ پریشانی ہو رہی تھی جو لنکا کے کسی باشندے کو تبت میں ہو۔ جہاں کے رسم و رواج رفتار و گفتار کا اسے علم نہ ہو۔

دفعہ ان کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ پر گھڑی ابھی قلیلہ کر رہی تھی۔ تاریخ کی سوئی نے تیز روی میں وقت کو مات کر دیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھے کہ گھڑی کو ٹھیک کر دیں۔ کہ اتنے میں رانی صاحبہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ سائیں داس نے گھڑی کو چھوڑا۔ اور رانی صاحبہ کے قریب پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ تصفیہ نہ کر سکے کہ ہاتھ ملاؤں۔ اس فردگزشت کا اثر ایک اضطراب کی صورت میں ان کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔ بارے رانی صاحبہ نے خود ہاتھ بڑھا کر انہیں اس الجھن سے نجات دی۔

رانی صاحبہ کا لباس بہت سادہ تھا۔ جُتہ نحیف، اس رعب اور تسکیم کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو شردت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک بے کسی کی سی جھلکتی تھی چہرہ درد اور التبا کی تصویر تھا۔ اس پر حسرت کا وہ شوخ رنگ تھا جو دوسروں کو جبراً رعایت، احسان، امانت پر مائل کرتا تھا۔ کوئی انسان جس کے پہلو میں دل ہو۔ اس کے جادو سے بے اثر نہ رہ سکتا تھا۔ ایک پیکر تالیف تھا۔ جس پر حسن و یاس کی تاثیر منقوش تھی۔ شامِ غم تھی۔ خاموش، زرد اور بے ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا زمانہ کے جو رستم نے اس میں شکوہ ستم کی آرزو بھی نہیں

باقی رکھی۔ جذبات دل فنا ہو گئے۔ اور تسلیم و توکل کے سوا اور کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

جب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تورانی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے معاملہ کی بات چیت شروع کی۔ پہلے برہنہ کی پرانی عظمت کا قصہ کہنے کے بعد اس نے ان سرقتوں کا ذکر کیا۔ جو رانی صاحبہ کی ذات سے عمل میں آئیں۔ چنانچہ فی الحال نہروں کی ایک شاخ نکالنے کے لیے دس لاکھ روپیہ کی ضرورت درپیش تھی۔ اور باوجودیکہ رانی صاحبہ کسی انگریزی بینک سے معاملہ کر سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایک ہندوستانی بینک کے حق کو ترجیح سمجھا۔ اب یہ فیصلہ انڈسٹریل بینک کے اختیار میں تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا نہیں۔

بنگالی بالو۔ ہم روپیہ دے سکتا ہے۔ مگر کاگوپتر دیکھے بنا کچھ نہیں کر سکتا۔ سیکرٹری۔ آپ کوئی ضمانت چاہتے ہیں؟

سامکس داس۔ (فیاضانہ انداز سے بولے) جناب ضمانت کے لیے آپ

کی زبان کافی ہے۔

بنگالی بالو۔ آپ کے پاس ریاست کا کوئی حساب کتاب ہے؟

لالہ سامکس داس کو اپنے ہیڈ کلرک کی یہ دنیا داری سخت گہری ناگوار گزری۔ وہ اس وقت فیاضی کے نشہ میں غمور تھے۔ رانی صاحبہ کی صورت التجا کافی ضمانت تھی۔ ان کے سامنے کاغذ اور حساب کا ذکر کرنا ناپسندیدہ معلوم ہوتا تھا جس سے بے اعتباری کی بو آتی ہے۔ انہیں اس وقت حساب کتاب کا ذکر سلفہ بن معلوم ہو رہا تھا۔ صنفِ لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتے بن جاتے ہیں۔

بنگالی بابو کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھ کر بولے۔ کاغذات کی جانچ کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ شرط صرف ہمارا اطمینان ہے۔“

بنگالی بابو۔ ڈائریکٹر لوگ کبھی نہ مانے گا۔

سائیں داس۔ ہم کو اس کی پروا نہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری پر روپے دے سکتے ہیں۔

رانی نے سائیں داس کی طرف نگاہِ تشکر سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نظر آیا۔ اس میں کچھ کامیابی کی مسرت تھی۔ کچھ حیثیت کی سفاکی۔ اور کچھ سودائے خام کی حقارت۔

————— (۲) —————

گرڈائریکٹروں نے حساب کتاب، آمدنی اور خرچ دیکھنا ضروری سمجھا۔ اور یہ کام لالہ سائیں داس کے سپرد ہوا۔ کیونکہ کسی اور کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی۔ کہ ایک پورے دفتر کا معائنہ کرتا۔ سائیں داس نے ضابطہ کی پابندی کی۔ تین چار دن تک کاغذات جانچتے رہے۔ اور اپنے اطمینان کی رپورٹ پیش کی۔ معاملہ طے ہو گیا۔ دستاویز مرتب ہوئی۔ روپیہ دیا گیا۔ شرح سود نو فیصدی قرار پایا۔

تین سال تک بینک کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا۔ چھٹے مہینے بے طلب و نقصانہم ہزار کی رقم یکمشت دفتر میں آجاتی تھی۔ معاملہ داروں کو پانچ فیصدی منافع دے دیا جاتا تھا۔ حصہ داروں کو ۷ فیصدی، اس طرح اس نفع کی کسر پوری ہو جاتی تھی۔ جو دوسرے وسائل سے حاصل ہوتا تھا۔ سائیں داس سے سب لوگ

خوش تھے۔ سب ان کی معاملہ نہی کے ملاح، یہاں تک کہ بنگالی بابو بھی رفتہ رفتہ ان کے قائل ہوتے جاتے تھے۔ سائیں داس ان سے کہا کرتے: ”بابو جی! اعتبار دنیا سے کبھی مٹتا ہوا ہے۔ اور نہ ہو گا۔ نیکی پر عقیدہ رکھنا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ جس شخص کے دل سے یہ عقیدہ اٹھ جاتا ہے۔ اسے زندہ درگور سمجھنا چاہیے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوں۔ بڑے سے بڑا کامل فقیر اسے رنگا ہوا سیار معلوم ہوتا ہے۔ سپحے سے سپحہ محبوب دطن اسے بندہ شہرت نظر آتا ہے۔ اسے دنیا دغا اور فریب سے پردھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل سے پر ماتا کی عزت اور عظمت غائب ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور فلاسفر کا قول ہے کہ ہر ایک انسان کو مشرّف سمجھو۔ تا دقتیکہ اس کے خلاف کوئی صریح ثبوت نہ ہو۔ موجودہ قوانین سیاست اسی معرکہ الارار اصول پر قائم ہیں۔ اور نفرت تو کسی سے کرنی ہی نہ چاہیئے۔ ہماری رو میں پاک ہیں۔ ان سے نفرت کرنا پر ماتا سے نفرت کرنے کے برابر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں دغا اور فریب نہیں ہے ہے اور بہت کثرت سے ہے۔ مگر اس کا علاج بدگمانی نہیں۔ قیافہ شناسی ہے۔ اور یہ خاص عطیہ ہے۔ جو ایثار کے دربار سے خاص خاص آدمیوں کو عطا ہوتا ہے۔ میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔ پر مجھے یقین ہے کہ انسان کی صورت دیکھ کر میں اس کے ضمیر کی بہت تک پہنچ جاتا ہوں۔ کوئی کتنا ہی بھیس بد لے۔ رنگ روپ بھرے۔ پر میری نگاہ باطن کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ بھی خیال رکھیئے۔ کہ اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ اور بے اعتباری سے بے اعتباری۔ یہ فطرت کا قانون ہے جس شخص کو ابتداء ہی سے مشاظر، حریف، فتنہ باز سمجھ لیں گے۔ وہ کبھی آپ سے صفائی اور خوش

معا ملکی نہ برتے گا۔ وہ خدا آپ کو زک دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس آپ ایک چور پر بھی اعتماد کریں۔ تو وہ آپ کا غلام ہو جائے گا۔ ساری دنیا کوٹوٹے۔ پر آپ کو دغا نہ دے گا۔ وہ کتنا ہی بدکار سیاہ کار حرام کار کیوں نہ ہو۔ پر آپ اس کے گلے میں اعتبار کی زنجیر ڈال کر اسے جس طرف چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آپ کے ہاتھوں میں نیکی کا آلہ بن سکتا ہے۔

بنگالی بابو کے پاس ان فلسفیانہ دلیلوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۴۱)

چوتھے سال کی پہلی ششماہی کی آخری تاریخ تھی۔ لالہ سائیں داس بینک کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ڈاکے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آج برہنہ سے پینتالیس ہزار روپیہ آئیں گے۔ اس لیے ششماہی منافع کا تخمینہ مرتب کر چکے تھے۔ اب کے ان کا ارادہ تھا کہ کچھ فرنیچر اور خریدیں۔ اب تک بینک میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس کا تخمینہ بھی طلب کر لیا تھا۔ امید کی مسرت چہرہ پر جھلک رہی تھی۔ مذاقاً کبھی بنگالی بابو سے کہتے۔ اس تاریخ کو میرے ہاتھوں میں خواہ مخواہ کھلی ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ہتھیلی کھجلا رہی ہے، کبھی دفتری سے کہتے۔ ارے میاں شفقت ذرا استخارہ تو کرو۔ محض سود ہی سود آ رہا ہے۔ یاد دفتر والوں کے لیے کچھ نذرانہ شکرانہ بھی ہے، امید کا اثر شاید درودِ یار پر بھی ہوتا ہے۔ بینک آج شگفتہ نظر آتا تھا۔

ڈاکہ عین وقت پر آیا۔ سائیں داس نے ایک شانِ استغنا سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے ہتھیلے سے کئی رجسٹر ڈلفافے نکالے۔ سائیں داس نے ان لفافوں



کو اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ برہل کا کوئی لفافہ نہ تھا، نہ بیمہ، نہ ہرن نہ وہ تحریر، کچھ مایوسی سی ہوئی۔ جی میں آیا ڈاکے سے پرچیں۔ کوئی اور رجسٹری رہ تو نہیں گئی۔ پر ضبط کیا، دفتر کے کلرکوں کے روبرو اتنی بے صبری نشان کے خلاف تھی۔ مگر جب ڈاکہ چلنے لگا۔ تو ان سے رہنا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے۔ ”اے بھئی کوئی بیمہ شدہ لفافہ رہ تو نہیں گیا؟ آج سے اسے آنا چاہیے تھا۔“ ڈاکے نے کہا۔ ”سرکار بھلا ایسی بات ہے اور کہیں بھول چرک ہو جائے۔ پر حضور کے کام میں ایسی بھول ہو سکتی ہے۔“ سائیں داس کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے کچے ونگس پر پانی پڑ جائے، ڈاکہ چلا گیا۔ تو بنگالی بابو کی طرف خطا وارنگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ”یہ دیر کیوں ہوئی؟ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔“

بنگالی بابو نے ناہمہ روانہ انداز سے جواب دیا۔ کسی سبب دیری ہو گیا ہو گا۔ گھبرانے کا کوئی بات نہیں ہے۔

مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ سائیں داس کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ شاید پارسل سے روپے آتے ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ تین اشرفیوں کو پارسل کر دیا ہو۔ اگرچہ وہ کسی سے اس خیالی کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پر انہیں یہ امید اس وقت تک لگی رہی۔ جب پارسل والا پوسٹ مین واپس نہ گیا۔ آخر شام کو وہ ایک پریشانی کی حالت میں اٹھ کر گھر چلے گئے۔ اب خط یا تار کا انتظار تھا۔ دو تین بار جھنجھلا کر اٹھے۔ کہ ڈانٹ کر ایک خط لکھوں۔ اور صاف صاف کہہ دوں۔ کہ ایسے معاملات میں وہ وعدہ خلافی سخت معاشکی کا ثبوت دیتی ہے۔ ایک دن کی تاخیر بھی بینک کے لیے ہلک ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایسی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

مگر پھر کچھ سوچ کر نہ لکھا۔

شام ہو گئی تھی، کئی احباب آگئے، گپ شپ ہونے لگی، کمپوسٹ مین نے آکر شام کی ڈاک سائیں داس کو دی، یوں وہ پہلے اخبار کو کھولا کرتے تھے، پر آج چٹھیاں کھول لیں، مگر برہل کا کوئی خط نہ تھا، تب بے دلی کے ساتھ ایک انگریزی اخبار کھولا، اور پہلے ہی تار کا عنوان دیکھ کر ان کا خون سرد ہو گیا۔

”کل شام کورانی صاحبہ برہل نے تین دن کی بیماری کے بعد وفات پائی“

اس کے آگے ایک مختصر نوٹ میں یہ مضمون درج تھا۔

”رانی صاحبہ برہل کی مرگ بے ہنگام صرف اس ریاست کے لیے نہیں بلکہ کل صوبے کے لیے ایک افسوس ناک سانحہ ہے۔ حکمران حاذق مرض کی تشخیص بھی نہ کر سکے تھے، کہ موت نے قصہ تمام کر دیا۔ رانی صاحبہ کو اپنی ریاست کی بہتری کا خیال ہمیشہ پر نظر رہتا تھا۔ ان کے مختصر دوران حکومت میں ان کی ذات سے ریاست کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ وہ عرصہ تک یادگار رہیں گے۔ اگرچہ یہ مسئلہ امر تھا، کہ ریاست ان کے بعد دوسرے ہاتھوں میں جائے گی۔ مگر یہ خیال رانی صاحبہ کے ادائے فرض میں کبھی نکل نہ ہوا۔ قانوناً انہیں ریاست کی کفالت پر کسی قسم کے مالی معاملہ کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مگر رعایا کے فلاح و اصلاح نے کئی موقعوں پر اس اس پابندی کو نظر انداز کرنے پر مجبور کیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان کی زندگی نے چند سال اور دنا کی ہوتی، تو ریاست ان کفولیبتوں سے سبکدوش ہو جاتی۔ انہیں شب و روز اس کی فکر تھی، تا نو فتنے بیچیدگیوں سے مغالطہ دینے کا گمان انہیں کبھی نہیں ہوا۔ مگر بے وقت موت نے اب یہ فیصلہ دوسرے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے، ان کفولیبتوں کا کیا

حشر ہوتا ہے۔ ہمیں معتبر وسائل معلوم ہوا ہے کہ نئے راجہ صاحب نے جو آج کل لکھنؤ میں روٹی افرورہیں۔ اپنے دکار کے مشورے کے مطابق مرحومہ کی مالی موخزات سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ عنقریب لکھنؤ کے مالی حلقے میں ایک زبردست ہل چل پیدا ہوگی۔ اور کتنے ہی اصحاب زر کو سبق مل جائے گا کہ سود کی ہوس خرم و احتیاط کی قیدیوں سے آزاد ہو کر کتنی مصرت کا باعث ہوتی ہے۔

لالہ سائیں داس نے اخبار میز پر رکھ دیا۔ اور آسمان کی طرف تاکا۔ جو ایسی کا آخری سہارا ہے۔ دوسرے احباب نے یہ خبر پڑھی۔ باہم اس مسئلہ کے قانونی پہلو پر گفتگو ہونے لگی۔ نوبت نگرار و حجت تک پہنچی۔ سائیں داس پر چاروں طرف سے بوجھاؤ پڑنے لگی۔ سارا الزام ان کے سر منڈایا گیا۔ امدان کی ایک مدت کی کار دانی، معاملہ فیہی اور مال اندیشی تک خاک میں مل گئی۔ بینک کے لیے اتنا زبردست نقصان برداشت کرنا غیر ممکن تھا اور اب یہ مسئلہ درپیش تھا۔ کہ اس کا جو ذکر کرنا قائم رہے۔

### — (۵) —

اس کے بعد ہفتوں تک متواتر صبح سے شام تک بینک میں بازگشت معاملہ داروں کا تالنگار ہوتا۔ جن لوگوں کی رقمیں بغیر مدت کی قید کے جمع تھیں۔ وہ ان کی واپسی پر بدبہ صد تھے۔ اور کوئی عذر نہ سنتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اسی اخبار کے نوٹ کا اثر تھا یا رقبوں کی خفیہ ریشہ دانیوں، کہ انڈسٹریل بینک کے خلاف سارے شہر میں بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ جبر سے کام لیتے، تو ایسی صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ کہ بینک اس صدمہ سے جانبر ہو جاتا۔ مگر شور و شش اور

طوفان میں کون سی کشتی ساکت رہ سکتی ہے؟ آخر خرابی نے انکار ہی جواب دینے شروع کیا۔ بینک کی رگوں سے خون کی اتنی دھاریں نکلیں کہ وہ بے جان ہو گیا۔

دو ماہ گزر گئے تھے۔ احاطہ میں ہزاروں سوداگران بینک جمع تھے۔ مگر مرنے والے کی آنکھیں بند تھیں۔ بنفص ساکت، زبان خاموش، آہ و بکا کی دلدوز صدا میں اٹھ رہی تھیں۔ پر یہ صدائے ماتم اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ بینک کے دعوازے پر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ دم دم پر طرح طرح کی افواہیں اڑتی تھیں۔ اور ہر ایک افواہ میں اس مجمع کثیر کو ہمہ تن گوش دہر تین چہم بنادیتی تھی۔ کبھی خبر اڑتی تھی، کہ لالہ سائیں داس نے زہر کھالیا، کوئی ان کی گرفتاری کی خبر لاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ ڈائریکٹر صاحبان زیر حراست ہو گئے۔

اور یہ کیفیت احاطہ ہی تک محدود نہ تھی۔ شہر میں کپہرام بچا ہوا تھا۔ روڈنے والوں سے زیادہ دردناک حالت ان کی تھی۔ جن کی آنکھیں شرمندہ غم نہ ہو سکتی تھیں جنہیں خانہ دانی وقار خود داری پر مجبور کیے ہوئے تھا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ صبر میں انتظار کی طاقت نہ رہی۔ ڈوبنے والے آفتاب کی طرح وہ بھی نالوسی کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجمع رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ دفعۃً سڑک بدر سے ایک موٹر نکلا۔ اور بینک کے سامنے آکر ٹرک گیا۔ کسی نے کہا، برہل کے راجہ صاحب کا موٹر ہے۔ اتنا سنتے ہی سینکڑوں آدمی وحشت کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے۔ مگر شکوہ بے داد کے لیے نہیں۔ صرف اس شخص کی صورت دیکھنے کے لیے جو ان کی کشتِ اُمید کا شہر تھا۔ جس کے ہاتھوں ان کی قسمتیں پامال ہو رہی تھیں۔ نوجوان کنور جگدیش سنگھ رانی صاحبہ کی وفات کے بعد وکیلوں سے قانونی مشورہ

لیسنے کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ رئیسانہ لوازمات کی خرید بھی ضروری تھی وہ آرزوئیں جو ایک مدت سے اسی موقع کی منتظر تھیں۔ اب بندھے ہوئے پانی کی طرح راہ پا کر اُبلی پڑتی تھیں۔ یہ موٹر آج ہی لیا تھا۔ شہر میں ایک بنگلہ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر اور شیشہ آلات کی ایک گاڑی برہل روانہ ہو چکی تھی۔ انگریزی جوہری بھی ان کی قدر دانیوں سے محروم نہ تھے۔ ارباب نشاٹ کی مجلسیں و زمانہ آراستہ ہوتیں۔ یہاں سے فرصت ملتی تو تھیٹر کی باری آتی۔ چڑیا قفس سے آزاد ہو کر ہر ایک ڈالی پر چمکتی پھرتی تھی۔ یہ مجمع دیکھا۔ تو خیال کیا کہ کوئی نیا تماشا ہونے والا ہے۔ موٹر روک دیا۔ کہ اتنے میں صد ہا آدمیوں نے آکر موٹر کو گھیر لیا۔

کنور صاحب نے پوچھا۔ ”یہاں آپ لوگ کیسے جمع ہیں۔ کوئی تماشا ہونے والا ہے کیا؟“

ایک صاحب جو وضع سے کوئی بگڑے رئیس معلوم ہوتے تھے بولے۔ ”جی ہاں بڑا دلچسپ تماشا ہے۔“  
کنور۔ ”کس کا تماشا ہے؟“  
”قسمت کا۔“

کنور صاحب کو اس جواب پر حیرت تو ہوئی، مگر سنئے آئے تھے کہ لکھنؤ والے بات بات پر شاعری کیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسی انداز سے جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوا، بولے۔ ”قسمت کا تماشا دیکھنے کے لیے یہاں آنا تو ضروری نہیں۔“  
لکھنؤی حضرت نے فرمایا۔ جناب کا فرمانا بجا ہے۔ مگر دوسری جگہ یہ لطف

کہاں۔ یہاں آج صبح سے شام تک قسمت نے کتنوں ہی کو امیر سے غریب، اور کتنوں ہی کو غریب سے فقیر بنا دیا۔ جو لوگ محلوں میں بیٹھے تھے، اس وقت انہیں درخت کی چھاؤں بھی میسر نہیں۔ جن کے دروازے پر زکوٰۃ بیٹھی تھی۔ اس وقت روٹیوں کو محتاج ہیں۔ ابھی تک ایک ہفتہ قبل جو لوگ شکوہ روزگار اور نیرنگی تقدیر اور جو رنک کو شاعرانہ استعارات سمجھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آہ دزاری نالہ عشق کو بھی شرمندہ کر رہی ہے۔ ایسے ہمت خیز تماشے اور کہاں دیکھنے میں آئیں گے۔

کنور صاحب اب اپنی حیرت کو نہ چھپا سکے۔ پوچھا، جناب آپ نے تو مجھے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ میں دہقانی آدمی ہوں۔ مجھ سے نثر میں بات کیجیے۔

اس پر ایک جھٹکین نے فرمایا: "حضرت یہ انڈسٹریل بینک ہے۔ اس کا دیوالہ ہو گیا ہے۔ آداب عرض ہے، بندہ کو بیچا نا؟"

کنور صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو موٹر سے اچھل پڑے۔ اور نیچے آکر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے: "ارے سٹر نیم؟ تم یہاں کہاں؟" یا ر تم سے مل کر روج تازہ ہو گئی۔"

سٹر نیم کنور صاحب کے ساتھ ڈیرہ دون کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ ڈیرہ دون کی پیارٹیوں کی سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ مگر جب سے کنور صاحب نے خاندانی حالات سے مجبور ہو کر کالج چھوڑا۔ دونوں دوستوں میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ نیم بھی ان کے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے تھے۔

نیم نے جواب دیا: "شکر ہے، آپ نے پیچا نا تو کہئے اب تو پو بارہ ہیں۔ کچھ

دوستوں کی بھی خبر ہے؟

گنور۔ یار مبالغہ نہیں، تمہاری یاد ہمیشہ آیا کرتی تھی۔ کہو آرام سے تو ہو؟  
میں رائل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج آؤ، تو اطمینان سے باتیں ہوں۔

نسیم۔ جناب اطمینان تو انڈسٹریل بینک کے ساتھ رخصت ہو گیا ہے۔ اب  
تو فکر معاش سر پر سوار ہے جو کچھ جمع تھی، آپ کے نذر ہوئی۔ اس دیوالہ نے فقیر  
بنادیا۔ اب آپ کے آستانوں پر دھرنادوں گا۔

گنور۔ یار تمہارا گھر ہے، بے تکلف آؤ، میرے ساتھ ہی کیوں نہ چلو؟ کیا  
بتاؤں مجھے مطلق معلوم نہ تھا کہ میری دست کشتی کا یہ اثر ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے  
بینک نے بتیروں کو تباہ کر دیا۔

نسیم۔ گھر گھر کھرا مچا ہوا ہے۔ میرے پاس اس جسم پر کے کپڑوں کے سوا  
اور کچھ نہیں رہا۔

اتنے میں ایک تلک دھاری پنڈت جی آگئے۔ ادربولے "ہمارا جاج! آپ  
کے جسم پر کپڑے تو ہیں۔ یہاں تو دھرتی اکاش کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ میں راگھوجی  
پاٹ سالاکا ادھیالپک ہوں۔ پاٹ سالاکا سب روپیہ اسی بینک میں جمع تھا۔  
بیچاس دو دیا رہتی۔ اس کی بددلت سنکرت پڑھتے تھے۔ اور بھوجن پاتے تھے۔  
کل سے پاٹ سالہ بند ہو جائے گا۔ دور دور کے دیا رہتی ہیں۔ وہ اپنے گھر کیسے  
پہنچیں گے۔ یہ ایسور ہی جلتے۔"

ایک صاحب جن کے سر پر پنجابی دھنغ کی گکڑی تھی۔ گاڑھے کاکوٹ اور  
چمرد دیا جوتا پہنے ہوئے تھے، آگے بڑھ آئے۔ اور ایک شان نیابت سے بولے

جناب اس بینک کے فلیور نے کتنے ہی انسٹی ٹیوشنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لالہ دیانا تھ کا یتیم خانہ ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا ایک لاکھ روپیہ ڈوب گیا۔ ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں۔ ڈیپوٹیشن سے لوٹا۔ تو پندرہ ہزار روپے یتیم خانہ کے فنڈ میں جمع کیے تھے۔ مگر اب کہیں کوڑی کا بھی ٹھکانا نہیں۔

ایک کہن سال بوڑھے نے کہا۔ ”صاحب میری تو عمر بھر کی کمائی مٹی میں بل گئی۔ اب کفن کا بھی بھروسہ نہیں۔“

رفتہ رفتہ اور لوگ جمع ہو گئے۔ اور عام گفتگو ہونے لگی۔ ہر شخص اپنے قریب کے آدمی کو اپنی مصیبت کی داستان سننے لگا۔ کنور صاحب آدھ گھنٹہ تک نیم کے ساتھ کھڑے یہ فسانہ غم سنتے رہے۔ جوں ہی موٹر پر بیٹھے اور ہوٹل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ ان کی نگاہ ایک خستہ حال آدمی کی طرف گئی۔ جو زمین پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک ابیر تھا۔ کنور صاحب کے ساتھ بچپن میں کھیلا تھا۔ اس وقت ان میں رتبہ کی یہ تیز نہ تھی۔ کنور صاحب نے بار بار اس کی دھولیں کھائی تھیں۔ اس کی گالیاں سنبھلتی تھیں۔ دونوں ساتھ کبڑی کھیلے تھے۔ ساتھ بیڑوں پر چڑھ کر چڑیوں کے بچے چراتے تھے۔ جب کنور صاحب ڈیرہ دون پڑھنے گئے۔ تو یہ ابیر کاڑ کا شیوہ اس اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ چلا آیا جس نے یہاں ایک دو دھک کی دکان کھول لی تھی۔ کنور صاحب نے اسے پہچانا۔ اور نہ دیکھا۔ ”ارے شیوہ اس؟ ادھر دیکھو شیوہ اس ادھر دیکھو“ شیوہ اس نے آواز سنی۔ مگر سر ادا پر نہ اٹھایا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا کنور صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب وہ جگدیش کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ جب دونوں بڑھے غفور میاں کا نہ چڑھا



کہ گھر میں چھپ جاتے تھے۔ جب وہ اشارے سے جگہ نش کو ماسٹر کے پاس سے بلا لیا کرتا۔ اور دونوں رام لیلا دیکھنے چلے جاتے۔ اسے یقین تھا کہ کنور صاحب مجھے بھول گئے ہوں گے۔ وہ بچپن کی باتیں اب کہاں کہاں میں اور کہاں وہ! لیکن جب کنور صاحب نے اس کا نام لے کر پکارا، تو بجائے اس کے کہ وہ خوش ہو کر ان سے ملے۔ اس نے اور بھی سر جھکا لیا۔ اور وہاں سے سرک جانا چاہا۔ کنور صاحب کا اخلاق اب اس خلیج پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا۔ جوان کے اور اس کے درمیان حائل عتی۔ مگر کنور صاحب اسے کھسکتے دیکھ کر موٹر سے اتر کر اس کے پاس آئے، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ”ارے شیو داس کیا نیچے بھول گئے“

شیو داس کو اس آواز میں پرانی بے تکلفی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کنور صاحب کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور پولا۔ ”بھولا تو نہیں۔ پر آپ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے“

کنور۔ یہاں دودھ کی دکان کرتے ہو کیا؟ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ نہیں تو ایک ہفتہ سے پانی پیتے پیتے زکام کیوں ہوتا؟ آؤ اس موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ ہوٹل تک چلو، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں یہاں لے چلوں گا۔ اور ایک بار پھر گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔

شیو داس۔ ایسا نہ کیجیے، نہیں تو دیکھنے والے ہنسیر ہوٹل میں آجاؤں گا۔ وہی حضرت گننے والے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں نہ۔

کنور۔ ضرور آؤ گے نہ؟

شیو داس۔ آپ آئیں گے۔ اور میں نہ آؤں گا؟

کنور۔ یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ وکان تو چل رہی ہے نا؟  
 شیو داس۔ آج صبح تک تو چلتی تھی۔ پر آگے کا حال نہیں معلوم؟  
 کنور۔ تمہارے روپے بھی بینک میں جمع تھے کیا؟  
 شیو داس۔ اب آؤں گا تو بتا دوں گا۔  
 کنور صاحب موٹر پر آ بیٹھے۔ اور شور سے کہا۔ ہوٹل کی طرف چلو۔  
 شو فر۔ حضور نے دباٹ وے کمپنی کی دکان پر چلنے کا حکم دیا تھا۔  
 کنور۔ اب ادھر نہ جاؤں گا۔

شو فر۔ جیکب صاحب بالشرط کے یہاں بھی نہ چلوں؟  
 کنور۔ (جھنجھلا کر) نہیں کہیں مت چلو۔ مجھے سیدھے ہوٹل پہنچا دو۔  
 یاس ودر د کے ان نظموں نے جگدیش سنگھ کے دل میں سوال پیدا کر دیا تھا۔  
 اب میرا کیا فرض ہے؟

————— (۶) —————

آج سے سات برس پہلے جب برہل کے راجہ صاحب نے عین عالم شباب میں  
 گھوڑے گر کر وفات پائی، اور وراثت مسئلہ پیش ہوا۔ تو راجہ صاحب کے کوئی  
 اولاد نہیں تھی۔ خاندانی سلسلہ میں ان کے حقیقی چچا زاد بھائی ٹھاکر رام سنگھ کو وراثت  
 کا حق پہنچتا تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا۔ مگر عدالتوں نے راجہ صاحب کی بیوی کے حق میں  
 فیصلہ کیا۔ ٹھاکر صاحب نے اپیلیں کیں۔ پریوی کونسل تک گئے۔ مگر کامیاب نہ  
 ہوئے۔ مقدمہ بازی میں لاکھوں روپے صرف ہو گئے۔ اپنے حصہ کی جائداد  
 بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر مقدمہ ہارنے پر بھی وہ اطمینان سے نہیں بیٹھے ہمیشہ

بیوہ رانی صاحبہ کو چھیڑتے رہتے۔ کبھی آسامیوں کو بھڑکاتے کبھی عوام کو رانی صاحبہ سے بدظن کرتے، کبھی فرضی مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ مگر رانی صاحبہ بھی بڑے جیوٹ کی عورت تھیں۔ وہ ٹھا کر صاحب کے ہر ایک وار کا دندان شکن جواب دیتیں۔ ہاں اس کش مکش میں انہیں کثیر رقمیں خرچ کرنا پڑتیں۔ آسامیوں سے روپے وصول نہ ہوتے۔ اس لیے بار بار قرض لینے پڑتے تھے۔ مگر چونکہ قانوناً وہ ریاست کفولیت پر قرض لینے کی مجاز نہ تھیں۔ اس لیے انہیں یا تو اس قانونی پیچیدگی کو چھپانا پڑتا تھا۔ یا سود کی بہت اونچی شرح قبول کرنا پڑتی تھی۔

کنور جگدیش سنگھ کا زمانہ طفولیت تو ناز و نعمت میں گٹھنھا مگر جب ٹھا کر رام سنگھ ان مقدمہ بازیوں سے بہت زیر باز ہو گئے۔ اور یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں رانی صاحبہ کی سازشوں سے کنور صاحب کی جان خطرہ نہ پڑ جائے۔ تو انہوں نے مجبور ہو کر کنور صاحب کو ڈیرہ دون بھیج دیا۔ کنور صاحب وہاں دو سال تک آرام سے رہے۔ لیکن جونہی وہ کالج کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے ٹھا کر صاحب راہی ملک عدم ہو گئے۔ کنور صاحب کو سلسلہ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ برہل چلے آئے۔ سر پر خاندان کی پرورش اور رانی صاحبہ سے پرانی عداوت نبھانے کا بار اُڑا اس وقت سے رانی صاحبہ کی وفات تک ان کی حالت بہت ابتر رہی۔ آمدنی کا ذریعہ یا تو قرض تھا یا مستورات کے زیور۔ اس پر خاندانی وقار کے قائم رکھنے کی فکر، یہ تین سال ان کے لیے سخت آزمائش کے دن تھے۔ ساہوکاروں سے آئے دن سابقہ رہتا تھا۔ ان کے تیر ستم سے جگر میں ناسور بڑھ گیا تھا۔ حکام کی سخت گیریاں اور بدعتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ مگر صوبہ سے دلخراش اپنے

عزیزوں اور یگانوں کا برتاؤ تھا جو سامنے دار نہ کر کے بغلی چوٹیں کرتے تھے۔ دوستی اور یگانگت کے پردے میں دغا کے ہاتھ چلاتے تھے۔ ان تجربات تلخ نے کنور صاحب کو اختیار اور ثروت اور دولت کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ وہ نہایت ذکی الحس آدمی تھے۔ اور یگانوں کی بے مہریاں اور ابنائے دطن کی بے وفائیاں ان کے دل پر داغِ سیاہ بنتی جاتی تھیں۔ ادبیات کے ذوق نے انہیں انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوگر بنا دیا تھا۔ اور یہ مطالعہ ہی انہیں روز بروز مہذب طبقہ سے دور لیے جاتا تھا۔ وہاں ان کے دل میں جمہوریت اور غریب دوستی کے خیالات راسخ گرتا جاتا تھا۔ ان پر روشن ہو گیا تھا۔ کہ سچی انسانیت اگر زندہ ہے تو جھوٹوں میں اور افلاس میں یہیں اس مصیبت کے زمانے میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں کبھی کبھی ہمدردی اور خلوص کی روشنی نظر آ جاتی تھی۔ اسی طبقہ میں وفادار اور ننگسار دوست ملتے تھے۔ دولت اور ثروت ان کی نگاہ میں ظاہر داری اور تکلف کا مترادف تھی۔ وہ اسے نعمتِ عظمت کی بجائے قہر الہی سمجھتے تھے۔ جو انسان کے دل سے انسانیت اور محبت کے جذبات کو مٹا دیتی ہے۔ وہ ابرسیاہ ہے۔ جو دل کے روشن تاروں پر چھا جاتی ہے۔

مگر رانی صاحبہ کی وفات کے بعد جو نہی دولت اور ثروت نے ان پر وار کیا۔ فلسفیانہ خیالات کی یہ سپر پاش پاش ہو گئی۔ دل پر ایک خود فراموشی کا نشہ چھا گیا۔ تحقیق باطن کی قوت زائل ہو گئی۔ وہ لوگ دوست ہو گئے جنہیں وہ دشمن سمجھتے تھے۔ وہ توافل اور سرد مہری کی زد میں آ گئے۔ جمہوریت کے دلائل میں حیرت انگیز ترمیم شروع ہوئی۔ ایک متملّانہ رواداری کا احساس

رد نما ہوا ہوا۔ فلسفہ یاس نے فلسفہ امید کو جگہ دی۔ حفظ وقار اور مناسبت حال کی زنجیر گلے میں پڑی۔ شعلہ درد انگیز قفس بتوڑیں میں رد پوش ہوا، دولت اور ثروت کے مینار بلند نے افلاس کے جھونپڑوں کو نظر سے پوشیدہ کر دیا، آئینہ مراسم نے زبان پر ہنر احتیاط لگا دی۔ وہ ارباب اختیار جنہیں دیکھ کر ان کے تیو تبدیل جاتے تھے۔ اب ان کے مشیر ہو گئے۔ بے نوائی اور برہنگی اور قناعت جو ان کی دل سوزیوں کی منظور نظر تھی۔ اب اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں جھٹک جاتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب اب بھی جمہوریت کے قائل تھے۔ مگر ان کے اظہار میں وہ پہلے کی سی آزادی نہ تھی۔ قول اب فعل سے قریب تر ہونے کے باعث باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے کی سی طرار و تیز شمشیر بہند نہ تھی۔ اس میں اب زنگ لگ گیا تھا۔ قول کے عملی کو اب وہ نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ اور میدانِ عمل انہیں دشواریوں سے پر نظر آتا تھا۔ بیگار کے وہ جانی دشمن تھے۔ مگر بیگار کو بند کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ صحت و صفائی کے زبردست مؤید تھے۔ مگر اب خراج سے قطع نظر باشندہ دل ہی کی طرف سے انحراف کا گمان ہوتا تھا۔ آسامیوں کے ساتھ لگان کے لیے سستی و جبر کو وہ شرک سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ضروری نظرات تھے۔ غرض کہتے ہی اصول جو پہلے جزو ایمان بن چکے تھے اب دائرہ عمل سے خارج ہوتے جاتے تھے۔

مگر آج بینک کے احاطہ میں جو دردناک نظارے ان کی نگاہ سے گزرے ان کے خفیہ جذبات درد کے لیے بانگِ سحر کا کام کر گئے۔ جسے کسی اور مجبوری کے

وہ دلفگار نالے گوشہ ہجر میں چبھ گئے۔ اس شخص کی سہی حالت ہو گئی۔ جو کشتی پر بیٹھا دریائے پر فضا ساحل کی سیر کرتا ہوا ایک کایک مرگھٹ کے سامنے آجائے۔ چتا پر لاشیں چلتے ہوئے دیکھے۔ سوگواروں کی آہ و زاریاں سنیں۔ اور کشتی سے اتر کر سوگواروں کے ماتم میں شریک ہو جائے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ کنور صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے احاطہ بینک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہی صدائیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ دل میں سوار ہو رہا تھا۔ کیا اس تباہی و بربادی کا باعث میں ہوں۔ میں نے وہی کیا جس کا مجھے قانوناً اور اخلاقاً پورا مجاز تھا۔ یہ بینک کے کارکن لوگوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے بغیر کافی ضمانت کے اتنی بڑی رقم قرض دے دی۔ معاملہ داروں کو انہیں کی گردن پکڑنی چاہیے۔ میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں۔ کہ دوسروں کی حماقتوں کا خمیازہ اٹھاؤں۔ ناحق اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ چالیس روپے روز دینے پڑیں گے۔ کوئی چار سو روپے کے متھے جائے گی۔ اتنا سامان بھی بیکار لیا۔ کیا ضرورت تھی نمبلی گدے کی کرسیوں سے یا شیشہ آلات کی سجادوں سے میری حقیقی شان نہیں بڑھ سکتی۔ کوئی معمولی مکان پانچ روپے روزانہ پر لے لیتا تو کیا کام نہ چلتا۔ میں اندر ساتھ کے سب آدمی آسائش سے رہتے۔ یہی ہوتا نا؟ کہ لوگ بدنام کرتے۔ اس کی کیا پروا۔ جن لوگوں کے ماتھے پر ٹھاٹھ کر رہا ہوں۔ وہ غریب تو رڈیوں کو بھی محتاج ہیں۔ یہ دس بارہ ہزار روپے لگا کر اگر کنویں بنوا دیتا، تو ہزاروں غریبوں کا بھلا ہو جاتا۔ اب آئندہ سے لوگوں کے چکمے میں نہ آؤں گا۔ یہ موٹر کار بالکل فضول ہے۔ میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی کفایت کی

خاطر دوسروں پر یہ ہینہ کا خرچ بڑھالوں۔ فاقہ کش آسامیوں کے سامنے موڑ دوڑانا ان کی چھاتیوں پر مونگ دلنا ہے۔ مانا کہ وہ رعب میں آجائیں گے۔ جدھر سے نکل جاؤں گا۔ سینکڑوں بچے اور عورتیں تماشادیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئیں گے۔ پر محض اتنی سی تسکینِ نخوت کے لیے اتنا خرچ بڑھانا حماقت ہے۔ اگر دوسرے رؤسا ایسا کرتے ہیں تو کریں۔ میں ان کی ریس کیوں کروں۔ اب تک دو ہزار روپیہ میں میرا سالانہ گزر رہا تھا۔ اب دو کے بدلے چار ہزار بہت ہیں۔ اور پھر مجھے دوسروں کی کمائی کو یوں اڑانے کا مجاز ہی کیا ہے؟ میں کوئی محنت نہیں کرتا۔ کوئی تجارت کوئی کاروبار نہیں کرتا جس کا یہ نفع ہو۔ اگر میرے بزرگوں نے اپنی ہسٹ دھرمی اور زبردستی سے کچھ علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ تو مجھے ان کے مالِ قیمیت میں شریک ہونے کا کیا حق ہے؟ جو لوگ محنت کرتے ہیں۔ انہیں اپنی محنت کا پورا ثمرہ ملنا چاہیے۔ سلطنت انہیں صرف دوسروں کی دستبرد سے بچاتی ہے۔ اس خدمت کا اسے مناسب معاوضہ ملنا چاہیے۔ پس میں تو سلطنت کی طرف سے یہ معاوضہ وصول کرنے کے لیے مامور ہوں۔ اس کے سوا میرا ان غریبوں کی کمائی میں اور کوئی حق نہیں۔ یہ بیچارے مفلس ہیں، جاہل ہیں، بے زبان ہیں۔ اس لیے فی الحال ہم انہیں جتنا چاہیں ستالیں۔ انہیں اپنے حقوق کی خبر نہیں۔ اپنی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ہم انہیں جتنا چاہیں پامال کر لیں۔ پر ایک دن ضرور آئے گا۔ جب ان کے منہ میں بھی زبان ہوگی۔ اپنے حقوق سمجھیں گے۔ اور تب دلے بر حال ماہِ نکلتا مجھے اپنی آسامیوں سے دور کیے دیتے ہیں۔ میری شان اسی میں ہے کہ انہیں میں رہوں۔ انہیں کی معاشرت اختیار کروں۔ اور ان کی بددردوں۔

ہاں تو اس بیک کو کیا کروں؟ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ ہوتا تو کہتا لاؤ۔ جہاں  
 اور سر پر پہنتا ہے بوجھ میں۔ وہاں اتنا اور سہی، پر دس لاکھ بہت ہوتے ہیں  
 بیچاں ہزار سود کے الگ ہوتے، اور پھر مہاجنوں کے بھی تو تین لاکھ روپے آتے ہیں  
 ریاست کی آمدنی ڈیڑھ دو لاکھ دہائیہ سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں اتنا بڑا  
 حوصلہ کروں بھی تو کس مدت پر؟ ہاں اگر فقیہی اختیار کر لوں۔ تو البتہ شاید میری زندگی  
 میں بشرطیکہ ناگہانی موت نہ آجائے، یہ قضیہ پاک ہو سکے۔ اس آنچ میں کو دنا اپنی  
 ساری زندگی کو۔ اپنے حوصلوں کو، آرزوؤں کو خاکستر کرنا ہے۔ آہ! اس دن کے انتظار  
 میں ہم نے کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں۔ والد صاحب نے اسی کوفت میں جان دی۔  
 یہ روزِ سعید ہمارے ایامِ تاریک کی دور افتادہ مشعل تھی۔ ہم اسی کے چرچے رہتے  
 تھے۔ اس سے دل کو کتنی تقویت کتنا غرور تھا۔ فاقہ کشی میں ہمارے تیور نہ میلے ہوتے  
 تھے۔ جب عبرت و انتظار کے بعد ایامِ نیک آئے۔ تو میں اس سے بے رخی کیونکر کروں؟  
 زندگی کی تناؤں پر پانی کیونکر پھیروں؟ اور کچھ اپنی ذاتی تناؤں تک تو خاتمہ نہیں۔  
 ریاست کی ترقی اور اصلاح کی کتنی تجویزیں دل میں قائم کر چکا ہوں۔ کیا اپنی تناؤں  
 کے ساتھ ان تجویزوں کو بھی ڈبو دوں؟ اس کینٹ رانی نے مجھے بڑی طرح پھانسا ہے  
 جب تک زندہ رہی کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ میری توتباہی کا سامان کر گئی! مگر میں  
 افلاس سے اتنا ڈر تکیوں ہوں؟ افلاس کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر میری آرزوؤں کا  
 خون۔ اگر میری زندگی کی قربانی ہزاروں خاندانوں کو تباہی اور خستہ حالی سے بچالے۔  
 تو مجھے اس قربانی سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔ آسائش سے زندگی بسر کرنا ہی تو ہماری  
 زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ کیا یہ تسکین کا باعث نہیں ہے کہ میری خانہ ویرانی حدیث



گھروں کی آبادی کا وسیلہ ہو؟ ہماری عزت اور شہرت اور یادگار ہماری تن آسانیوں سے نہیں ہو سکتی۔ محلوں میں رہنے والے اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانے والے رانا پر تاپ کو کون جانتا؟ یہ اس کی تکلیفیں۔ اس کی قربانیاں، اس کی فائدہ کشیاں ہیں جنہوں نے اسے ہماری قوم کا آفتاب بنا دیا ہے۔ رام چندر نے اگر اپنی زندگی عیش و عشرت میں بسر کی ہوتی، تو آج ہم ان کا نام بھی نہ جانتے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ہماری عظمت ہماری دولت اور ہمارے سامان عیش سے بے نیاز ہے۔ میں موٹر پر سوار ہوا تو کیا، اور ٹوپی پر سوار ہوا تو کیا؟ ہوٹل میں ٹھہرا تو کیا؟ بہت ہو گا۔ میرے تعلق دار بھائی مجھ سے کنارہ کش رہیں گے میرے حوالی موالی مجھ سے الگ ہو جائیں۔ اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہوں۔ اگر محض اتنی تکلیف سے صد ہا خاندانوں کا بھلا ہو جائے۔ تو میں انسان نہیں ہوں۔ اگر اسے شوق سے قبول نہ کر دوں۔ اگر اپنے گھوڑے اور فٹن سیر و شکار، نوکر چاکر اور زمانہ ساز اعزہ و آتش خواروں سے محروم ہو کر میں ہزاروں امیر و غریب خاندانوں کا بیواؤں کا۔ یتیموں کا بھلا کر سکوں تو مجھے اس میں مطلق تاثر نہ ہونا چاہیے، ہزاروں خاندانوں کی قسمت اس وقت میری مٹھی میں ہے۔ میری تنہا پروری ان کا زہر قاتل اور میری نفس کشی ان کا آبِ حیات ہے۔ میں آبِ حیات بن سکتا ہوں۔ تو زہر قاتل کیوں بنوں۔ اور پھر اسے نفس کشی سمجھنا بھی میری زیادتی ہے۔ یہ بالکل اتفاقی امر ہے۔ کہ میں آج اس جاؤ پر تائب ہوں۔ میں نے اسے کمایا نہیں، حاصل نہیں کیا۔ اس کے لیے خون نہیں گرایا پسینہ نہیں بہایا۔ اگر مجھے یہ جاؤ نہ ملتی۔ تو آج اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح میں

بھی فکر معاش میں مصروف ہوتا، میں کیوں نہ بھول جاؤں کہ میں اس ریاست کا مالک ہوں۔ ایسی ہی آزمائشوں میں انسانیت کی پہچان ہوتی ہے میں نے برسوں کتب بینی کی۔ برسوں انسانی فلاح کے اصول قائل رہا۔ یقیناً یہ میری انتہا درجہ کی بزدلی، نفس پرستی ہے۔ اگر اس موقع پر میں ان تمام اصولوں کو بھلا دوں۔ خود غرضی کو انسانیت اور اخلاق پر غالب آجانے دوں۔ خود غرضی کا سبق سیکھنے کے لیے مجھے گیتا اور مل اور انیس اور ارسطو کے شاگرد بننے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سبق تو مجھے اپنے دوسرے بھائیوں سے مفت مل جاتا۔ عام رواج سے بہتر اور کون استاد تھا؟ عام آدمیوں کی طرح میں بھی خود غرضی اور ہوس پرستی کے آگے سر جھکا دوں۔ تو پھر خصوصیت کہاں رہی؟ نہیں میں کنونشن (درواج) کی غلامی نہ کروں گا۔ جہاں ثواب کر سکتا ہوں، عذاب نہ کروں گا۔ جہاں دُعا مل سکتی ہے۔ آہ نہ لوں گا۔ ایثار! تم میری مدد کرو، تم نے مجھے راجپوت کے گھر پیدا کیا ہے۔ میری ذات سے اس جانا باز قوم کو شرمندہ مت کرو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ گردن خود غرضی کے آگے نہ جھکے گی۔ میں رام اور بھیم اور پرتاپ کا جانشین ہوں۔ تن پروری کا غلام نہ بنوں گا۔ نفس کی اطاعت نہ کروں گا۔

کنور جگدیش سنگھ کو اس دقت ایسا احساس ہوا۔ گویا وہ کسی اونچے مینار پر چڑھ گئے ہیں۔ دل میں امنگ اُٹھ گئی۔ اُنکھیں روشن ہو گئیں۔ مگر ایک ہی ٹوٹے بعد اس امنگ کا اتار ہونے لگا۔ اونچے مینار سے نیچے کی طرف اُنکھیں گئیں۔ سارا جسم کانپ اٹھا۔ سر میں چکر سا آگیا۔ اس آدمی کی سی حالت ہوئی جو کسی ندی کے کنارے بیٹھا ہوا۔ اس میں کودنے کا ارادہ کر رہا ہو۔

انہوں نے سوچا، کیا میرے گھر کے لوگ مجھ سے متفق ہو بھی جائیں تو مجھے مجاز کہ اپنے ساتھ ان کی متناؤں کا بھی خون کروں؟ اور تو اور ماتا جی کبھی نہ مانیں گے اور غالباً بھائی لوگ بھی گریز کریں۔ ریاست کی حیثیت کے لحاظ سے وہ کم سے کم دس ہزار سالانہ کے مستحق ہیں۔ اور ان کے حق کو میں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں صرف اپنی ذات کا مختار ہوں۔ مگر میں بھی تو تنہا نہیں ہوں۔ سادتری آپ چاہے میرے ساتھ آگ میں کودنے کو تیار ہو جائے۔ مگر اپنے پیارے لختِ جگر کو کبھی اس پر خ کے قریب نہ آنے دے گی۔

کنور صاحب نہایت خطرناک زمین پر قدم رکھ رہے تھے۔ اور ہر ایک قدم انہیں بلاتا تھا۔ کہ آگے مت بڑھو، انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو بڑے ناز و نعمت سے پالایا تھا۔ نکبت و ادبار کے زمانہ میں بھی اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ ہونے پائی تھی۔ کنور صاحب خود چھاپے بیل گاڑیوں پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہوں۔ مگر یہ نوبت کبھی نہیں آئی، کرپٹ کے کی سواری میں ٹانگن نہ رہا ہو، امارت و ریاست کا غرور اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ سادتری اسے ہمیشہ راجہ صاحب کہا کرتی چار سال کا نادان بچہ غرور اور تکنت کا پتلا بن گیا تھا۔ اس کی پیشانی جسے اقبال کا نور جھلکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک تلکھم اور باتوں سے ایک خود سری کی شان ٹپکتی تھی کیا باغ ریاست کی اس زمین کو بادل و حادث کا نشانہ بننے دوں؟ کون سا منہ لے کر سادتری سے یہ باتیں کہوں گا۔! جب سے شادی ہوئی ہے۔ اس غریب کو کبھی نہ کبھی سحر ہو گی۔ اور جب کہ سحر ہو گئی۔ سوئی ہوئی خواہشیں بیدار ہوئیں خوشیوں کے چپکنا شروع کیا، تو یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ وہ سحر شبِ غم سے بھی زیادہ تاریک ہو جہاں امید

کے ستارے بھی نہیں چمکتے۔ جہاں وہ رات کی ٹھنڈک نہیں، شبنم نہیں۔ وہ جان بخشی نیند نہیں۔ وہ پُر مزہ خواب نہیں۔ وہ کیفیت انگیز سکوت نہیں۔ یہ ستم ہے۔ تہر ہے!

کنور صاحب اور زیادہ نہ سوتے سکتے۔ وہ ایک سراسیمگی کی حالت میں پلنگ پر سے اٹھ بیٹھے۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ذرا دیر کے بعد انہوں نے جنگلے کے باہر کی طرف جھانکا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ چاروں طرف اندھیر تھا۔ ان کی پریشانیوں کی طرح بے انتہا اور عمیق سامنے گومتی ندی بہتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ندی کے کنارے چلے گئے۔ اور دیر تک وہاں ٹہلتے رہے۔ دل مضطرب و امواج دریا سے کوئی مناسبت ہے۔ شاید اس لیے کہ لہریں بھی مضطرب ہیں۔

انہوں نے اپنے بہکتے ہوئے خیالات کو پھر مجتمع کیا۔ اگر ریاست کی خالص آمدنی سے یہ پیشہ دیتے دیئے جائیں گے۔ تو فرض کا سود نکلتا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ کیا آمدنی میں اضافہ نہیں ہو سکتا؟ ابھی اصطبل میں بیس گھوڑے ہیں میرے لیے ایک کافی ہے۔ ملازموں کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ میرے لیے دو کافی سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ انسانیت سے بعید ہے۔ کہ اپنے ہی بھائیوں سے ذلیل خدشیاں کرائی جائیں۔ ان آدمیوں کو میں اپنی سیر کی زمین دے دوں گا۔ آرام سے کھیتی کریں گے۔ اور مجھے دعائیں دیں گے۔ باغیچوں کے پھل اب تک ڈائیوں اور تھنوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اب انہیں فروخت کر دوں گا۔ اور سب سے بڑی رقم تو بیانی کی ہے صرف ہمیشہ گنج کے بازار سے دس ہزار روپے وصول ہوتے ہیں۔ یہ سب رقم بہت جی ہضم کر جاتے ہیں۔ ان کے لیے ایک ہزار روپے سال کافی ہونے چاہئیں

اب کی اس بازار کا ٹھیکہ کر دوں گا۔ آٹھ ہزار سے کم نہ ملیں گے۔ ان بدوں سے پچیس ہزار سالانہ کی نکاسی ہو سکتی ہے۔ سادتری اور لٹا (ٹکا) کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہوار بہت ہے۔ میں سادتری سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یا تو ایک ہزار روپیہ ماہوار لو، اور مجھے چھوڑ دو۔ زانی بننے کی ہوس ہے۔ تو شوق سے بنو۔ مگر میں راجہ نہ بنوں گا۔

دفعۃً کنور صاحب کے کانوں میں آواز آئی۔ لام نام ست ہے۔ انہوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کئی آدمی سڑک پر ایک لاش لیے آتے تھے۔ ان لوگوں نے ندی کے کنارے چتا بنائی اور آگ لگا دی۔ دو عورتیں مین کر کے رو رہی تھیں۔ اس مین کانور صاحب کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دل میں شرمندہ ہو رہے تھے۔ کہ میں کتنا سنگدل ہوں۔ ایک غریب آدمی کی لاش جل رہی ہے۔ عورتیں رو رہی ہیں اور میرا دل ذرا بھی نہیں پسجتا۔ پتھر کی مورت کی طرح کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ یکایک ایک عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "ہا۔ میرے راجہ! تمہیں بس کیسے میٹھا لگا؟" یہ دلخراش مین سستے ہی کنور صاحب کے جگر میں ایک ٹھیس سی لگ گئی۔ بے اثری کا برف پھٹ گیا۔ رقت اُٹھ آئی۔ اور آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ غالباً اس غریب نے زہر کھا کر جان دی ہے۔ ہائے اسے زہر کیسے میٹھا لگا! اس میں کتنا درد ہے۔ کتنی حسرت، کتنی حیرت، زہر تو کڑوی چیز ہے۔ وہ کیونکر میٹھی ہو گئی۔ زہر تلخ کے بدلے جس شخص نے جانا شیریں دے دی۔ اس پر کوئی بڑا سا نمہ آیا ہو گا۔ ایسی ہی حالت میں زہر میٹھا ہو سکتا ہے۔ ان چند لفظوں میں تاثیر درد کا ایسا جامد بھرا ہوا تھا کہ کنور صاحب تڑپ گئے۔ یہی صدائیں بار بار ان کے تار جگر میں گونجتی تھیں۔ ان

میں انہیں معنی و جذبات کا ایک دفتر چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب ان سے وہاں کھڑا رہا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان سوگواروں کے پاس آئے، اور ایک آدمی سے پوچھا۔ کیا بہت دنوں سے بیمار تھے؟ اس آدمی نے کنور صاحب کی طرف ایک حسرت ناک انداز سے دیکھا، اور بولا نہیں صاحب کہاں کی بیماری، ابھی آج شام تک مرے میں باتیں کر رہے تھے۔ معلوم نہیں شام کو کیا کھالیا۔ کہ خون کی تے آئے لگی۔ جب تک حکیم صاحب کے یہاں جائیں۔ تب تک آنکھیں الٹ گئیں، نبض چھوٹ گئی۔ حکیم صاحب آکر دیکھا، تو کہا، اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے زہر کھالیا۔ بس صاحب گھر رونا پیٹنا ہونے لگا۔ ابھی کل بائیس تیس سال کی عمر تھی۔ ایسا بچھا سارے لکھنؤ میں نہیں تھا۔

کنور کچھ معلوم نہیں ہوا۔ زہر کیوں کھالیا؟

اس آدمی نے مشتبه لگا ہوں سے دیکھ کر کہا۔ صاحب اور تو کوئی بات نہیں ہوئی جب سے یہ بڑا بینک ٹوٹا ہے۔ بہت اداس رہتے تھے۔ کئی ہزار روپے بینک میں جمع کیے تھے، گھٹی، دودھ، ملائی کی بڑی دکان تھی۔ برادری میں مان تھا۔ وہ ساری جمع ڈوب گئی۔ ہم لوگ منع کرتے تھے۔ کہ بینک میں روپیہ نہ رکھو، مگر صاحب ہو ہی تو یہ تھی۔ کہ کسی کی نہیں سنی۔ آج صبح بیوی سے کہنے مانگنے تھے۔ کہ گرد رکھ کر ہیروں کو دودھ کا دام دیں۔ اس سے باتوں باتوں میں تکرار ہو گئی۔ بس صاحب نہ جانے کہاں سے زہر لا کر کھالیا۔

کنور صاحب کے جگر میں ایک ریشہ سا آگیا۔ مٹا خیال گزرا۔ شیو داس تو نہیں ہے پوچھا، کیا ان کا نام شیو داس تو نہیں تھا؟ اس آدمی نے حیرت سے دیکھ کر

کہا۔ ”ہاں صاحب یہی نام تھا، آپ سے جان پہچان نہ تھی کیا؟“  
 کنور۔ ”ہاں ہم اور وہ بہت دنوں تک برہل میں ساتھ ساتھ کھیلے تھے۔ آج شام  
 کو وہ ہم سے بنگ گھر کے احاطے میں ملے تھے۔ اگر انہوں نے مجھ سے ذرا بھی ذکر کیا ہوتا۔  
 تو میں حتی الامکان ان کی مدد کرتا، افسوس“

اس آدمی نے اب کنور صاحب کو غور سے دیکھا۔ اور جا کر عورتوں سے بولا۔ ”چپ  
 ہو جاؤ، برہل کے راجہ صاحب آئے ہیں“ اتنا سنتے ہی شیوہ اس کی ماں نے زور  
 زور سے سر پٹیا۔ اور روتی ہوئی آکر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑی۔ اس کی  
 زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے۔ ”بیٹا بچپن میں تم اسے بھیٹا کہا کرتے تھے.....“ اور  
 گلا پھنسنے لگا۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ شیوہ اس کی تصویر ان  
 کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر دوستانہ بے تکلفی اور غلوں کی جگہ ایک  
 شکوہ بے کس تھا جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ تم نے دوست ہو کر میری جان لی“

————— (۷) —————

صبح ہو گئی۔ مگر کنور صاحب کی آنکھیں خواب سے آشنا نہ ہوئیں۔ جب سے وہ  
 گومتی کے کنارے سے لوٹے تھے۔ ان کے دل پر ایک دیوار اگ سا چھایا ہوا تھا۔ وہ  
 رقت انگیز نفاہ نفس کی خود مغر خاندانہ دلیلوں کے لیے دیوار آہن بنا ہوا تھا۔ اس نے  
 ترنزل کو استحکام کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ سادتری کی دل شکنی، لالا کی مایوسانہ  
 حذر اور مان کی زبان جسے ارادہ شکن اسلمہ اس دیوار آہن سے سر ٹکرا کر ناکام چلے  
 جاتے تھے۔ سادتری کڑھے گی کڑھے، لالا کو کشمکش حیات میں کو دنا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ  
 نہیں۔ اماں جان دینے پر آجائیں گی۔ بہتر ہے، میں اپنے زن و فرزند، خویش و برادر

کے لیے ہزاروں خاندانوں کا خون نہ کروں گا۔ آہ! شیو داس کو زندہ دیکھنے کے لیے میں ایسی ایسی کئی ریاستیں نشانہ کر سکتا ہوں۔ سادتری کو فائدہ نہ کرنا پڑے۔ لٹا کو مزدوری نہ کرنا پڑے۔ مجھے در بدر بھیک مانگنا پڑے۔ تب بھی دوسروں کا گلہ نہ بادل گا۔ اب دیر کرنے کا موقع نہیں، معلوم نہیں آج کل یہ خانہ برباد یا کون سے پہلو اختیار کریں۔ کیا کیا ستم ڈھائیں۔ مجھے اتنا پس و پیش کیوں ہو رہا ہے بعض نفس کی کمزوری ہے۔ ورنہ کوئی ایسا بڑا کام نہیں جو کسی نے نہ کیا ہو۔ آئے دن لوگ لاکھوں روپے خیرات کرتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی ہمارے ایک صاحب نے اپنی بارہ لاکھ سالانہ نفع کی جائداد تعلیم نواں کے لیے وقف کر دی ہے۔ میں اتنا پست ہمت کیوں ہو جاؤں؟ میں اتنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس سے کہیں منہ موڑوں جو کچھ ہو چاہے سر پر جو کچھ پڑے۔ اس کی کیا فکر؟ گھنٹی بجائی، ایک لمحہ میں اردلی اٹکھیں ملتا ہوا حاضر ہوا۔

کنور صاحب بولے، ”ابھی جیکب صاحب بالشرطے پاس جا کر میرا سلام دو۔ جاگ گئے ہوں گے۔ کہنا نہایت ضروری کام ہے۔ نہیں یہ رقعہ لیتے جاؤ۔ موٹر تیار کرالو۔“

— (۸) —

مستر جیکب نے کنور صاحب کو بہت سمجھایا کہ آپ اس دل دل میں قدم نہ رکھئے۔ ورنہ نکلنا محال ہو جائے گا۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنی ایسی رقیب ہیں جن کی آپ کو خبر نہیں ہے۔ آپ کی جانب سے اعلان ہوتے ہی سب اپنے اپنے دعوے پیش کریں گے اور آپ کو بھی دعوے قبول کرنے پڑیں گے۔ اس وقت آپ کسی کو



مستثنیٰ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ مگر دل میں قائم ہونے والا فیصلہ چونے کا فرسش ہے۔ جسے نہایتش کے پتھر پڑے کمزور کرنے کے بجائے اور بھی مضبوط کر دیتے ہیں کنور صاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے اور دوسرے دن اخباروں میں اعلان کر دیا کہ ہم برہیل کی رانی صاحبہ مرحومہ کی کل مالی ذمہ داریوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور معیار وعدہ کے اندر انہیں ادا کر دیں گے۔

اس اعلان کے متعلق ہوتے ہی سارے لکھنؤ میں ہل چل ہو گئی۔ باخبر لوگوں کی رائے میں یہ کنور صاحب کی عترتِ حماقت تھی۔ اور جو لوگ قانون سے بے خبر تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ ایسے بہت کم آدمی تھے۔ جنہوں نے کنور صاحب کی نیت کی صفائی اور اخلاقی احساس کی داد دی ہو۔ مگر داد چاہے نہ ملی ہو۔ دعاؤں کی کمی نہ تھی۔ بینک کے ہزاروں غریب معاملہ دار سچے دل سے کنور صاحب کو دعائیں دے رہے تھے۔

ایک ہفتہ تک کنور صاحب کو سراٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ سڑجیکب کا خیال درست نکلا۔ مطالبات کی فہرست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کتنے ہی پروٹوٹ ایسے ملے۔ جن کا انہیں مطلق علم نہ تھا۔ جو ہریوں اور دوسرے بڑے بڑے دکانداروں کی یافتنی بھی کم نہ تھی۔ تخمینہ تیرہ چودہ لاکھ کا تھا۔ میزان بیس لاکھ کے قریب جا پہنچا۔ کنور صاحب گھبراتے، اندیشہ ہوا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کو بھی وثیقہ سے محروم کرنا پڑے۔ جس کا انہیں کوئی مجاز نہ تھا۔ یہاں تک کہ ساتویں دن انہوں نے کئی دکانداروں کو سخت سست کہہ کر سامنے سے دور کر دیا۔ جہاں سرح سود زیادہ تھی۔ اس کی تخفیف کر دائی۔ اور انفقار میعاد کی قید سے فائدہ اٹھانے میں مطلق

تاکل نہ کیا۔ انہیں ہبا جنوں کی سمجھ گیری پر غصہ آتا تھا۔ ان کے خیال میں ہبا جنوں کو ڈوبتی ہوئی رقم کا ایک حصہ مل جانے پر بھی اپنی تقدیر کا شکور ہونا چاہیے تھا۔ ان جزہ رسیدوں کے باوجود کل مطالبات کی میزان انیس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

کنور صاحب ان کاموں سے فرحت پا کر ایک روز انڈسٹریل بینک کی طرف جانکلے۔ بینک کھلا ہوا تھا۔ تین مُردہ میں جان آگئی تھی۔ اس کا تنفس جاری ہو گیا تھا۔ باز کش معاملہ داروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش خوش جا رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی مدد ہا آدمی فرط عقیدت سے ان کی طرف دوڑے۔ اور کسی نے رد کر، کسی نے ان کے قدموں کو بوسہ دے کر، کسی نے زیادہ ہندب طریق سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بینک کے عملوں سے بھی ملے۔ لوگوں نے کہا کہ اس اعلان نے بینک کو زندہ کر دیا۔ بنگالی بالوں نے سابق منجر لالہ سائیں داس پر گل انشائی شروع کی۔ وہ سمجھتا تھا۔ دنیا میں سب آدمی بھلا مانس ہے۔ ہم کو نصیحت کرتا تھا۔ اب اس کا آنکھ کھل گیا ہے۔ اکیلا گھر میں بیٹھا رہتا ہے کسی کو منہ نہیں دکھاتا۔ ہم سنتا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ چاہتا تھا۔ پر بڑا صاحب بولا، تم بھاگے گا۔ تو ہم لوگ تمہارے اوپر وارنٹ جاری کر دے گا۔ اب سائیں داس کی جگہ بنگالی بالو منتخب ہو گئے تھے۔

اس کے بعد کنور صاحب برہل آئے۔ بھائیوں نے یہ قصہ سنا۔ تو بگڑے، اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ ماما جی کو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ اسی دن بیمار ہو گئیں۔ اور ایک ہی ہفتہ میں یالوس دالم زدہ اس دنیائے اسباب سے رخصت ہو گئیں۔ سادہ سادگی کو بھی چوٹ لگی۔ پر اس نے محض صبر ہی نہیں کیا۔ بلکہ شوہر کی فیاضی اور رشتہ

کی تعریف کی، رہ گئے، لال صاحب، اس نے جب دیکھا کہ اصطبل سے گھوڑے نکلے جاتے ہیں۔ ہاتھی کن پور کے میلے میں بکٹے کے لینے بھیج دیئے گئے۔ کہا کہ درخواست کیے جا رہے ہیں۔ تو گھبرا یا ہوا کنور صاحب کے پاس آکر بولا: ”بابو جی! یہ سب آدمی گھوڑے ہاتھی کہاں جا رہے ہیں۔“

کنور صاحب نہ ہر خند سے بولے۔ ”یہ ایک راجہ صاحب کے نوید میں شریک ہوتے جا رہے ہیں۔“

لال صاحب۔ کون سے راجہ ہیں؟

کنور۔ ان کا نام راجہ غریب سنگھ۔

لال صاحب۔ کہاں رہتے ہیں؟

کنور۔ بے کسی گنج ہیں۔

لال صاحب۔ تو ہم بھی جائیں گے۔

کنور۔ تمہیں بھی لے چلیں گے۔ مگر اس بارات میں پیدل چلنے والوں کی

عزت سواروں سے زیادہ ہوگی۔

لال صاحب۔ تو ہم بھی پیدل چلیں گے۔

کنور۔ وہاں محنتی آدمی کی تعریف ہوتی ہے۔

لال صاحب۔ تو ہم خوب محنت کریں گے۔

کنور صاحب کے دونوں بھائی پانچ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وراثت لے کر الگ

ہو گئے۔ کنور صاحب اپنے اور اپنے عیال کے لیے مشکل تمام ایک ہزار روپیہ سالانہ

کا انتظام کر سکے۔ مگر یہ رقم ایک رئیس کی شان اور وقار کے لیے کسی طرح کافی نہیں

ہے۔ حاجتمند لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ سادھو صفت بھی دو چار ہمیشہ بڑے رہتے ہیں۔ ان سب کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ ادھر ایک سال سے شیو داس کے خاندان کا ہار بھی سر پہا پڑا ہے۔ مگر کنور صاحب کبھی اپنے فیصلہ پر افسوس نہیں کرتے۔ انہیں کبھی کسی نے ملول نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ مردانہ قناعت اور غرور صادق سے منور نظر آتا ہے۔ ادبیات کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ اب باغبانی سے الفت ہو گئی ہے۔ اپنے باغ میں صبح اور شام پودوں کی دیکھ بھال کیا کرتے ہیں۔ اور لال صاحب تو پکے کسان ہوتے نظر آتے ہیں۔ ابھی نو دس سال سے زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن منہ اندھیرے کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہیں رہتی۔ ان کا گھوڑا موجود ہے۔ مگر ہفتوں اس پر سوار نہیں ہوتے۔ ان کی یہ دھن دیکھ کر کنور صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور کہا کرتے ہیں "اب میں ریاست کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہوں۔ لال صاحب اس سبق کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ گھر میں دولت رہتی تو عیش اور شکار اور شرارت کے سوا اور کیا سوچتی؟ دولت بیچ کر ہم نے محنت اور قناعت خریدی۔ اور یہ سود بُرا نہیں ہے" مگر سادتری اتنی قانع نہیں۔ وہ کنور صاحب کی ممانعت کے باوجود اسیوں سے چھوٹے موٹے تحفے لے لیا کرتی ہے۔ اور خاندان کے رعب میں فرق نہیں آنے دیتی۔

# ایمان کا فیصلہ

کان پور کے ضلع میں پنڈت بھگودت مصر ایک بڑے زمیندار تھے۔ منشی ست  
نرائن لعل ان کے مختار عام تھے۔ ساری ریاست کا سیاہ و سفید ان کے ہاتھ میں تھا۔  
بڑے آقا پرست متدین آدمی تھے۔ لاکھوں روپیہ کا تحفیل وصول اور ہزاروں من غلہ  
کالین دین انجام دیتے تھے۔ اور سارا انتظام اس خوبصورتی سے کرتے کہ ریاست  
روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ایسے وفا کیش ملازم کی جتنی عزت ہونی چاہیے تھی، وہ  
ہوتی تھی۔ شادی و غم کی ہر ایک تقریب میں پنڈت جی بڑی سیرچشی سے پیش آتے  
تھے۔ رفتہ رفتہ ان پر اتنا اعتبار ہو گیا کہ کائنات کا سمجھنا بھی ترک کر دیا۔ خانگی  
مصارف کا حساب تک منشی جی کے ذمہ کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں پنڈت جی مر گ  
ئے۔ بے ہنگام کے شکار ہوئے۔ گنگا نہانے گئے تھے۔ معلوم نہیں کسی گڑھے میں پھسل پڑے۔

یا کوئی جانور کھینچنے لگیا۔ اس کا پھر ہتہ نہ چلا۔

اب منشی ست نرائن لال کے اختیارات اور بھی وسیع ہوئے۔ بجز ایک بیوہ عورت اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے خاندان میں اور کوئی نہ تھا۔ مراسم وفات سے فرصت پانے کے بعد ایک روز بد نصیب بھان کنور نے انہیں بلایا۔ اور درکربولی، لالہ، سوامی جی تو ہمیں بھندار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ڈونگا تمہیں پار لگاؤ تو لگ سکتا ہے، یہ سب کھیتی تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ اسے تمہارے اوپر چھوڑتی ہوں۔ یہ تمہارے بچے ہیں۔ ان کا منہ دیکھو۔ جب تک تمہارے مالک جسے تمہیں اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ مجھے بشو اس ہے کہ تم اس طرح اس بوجھ کو سنبھالے رہو گے۔

ست نرائن لال نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”بھائی! بھیا کیا اٹھ گئے میری تقدیر پھوٹ گئی۔ نہیں تو مجھے آدمی بنا دیتے۔ میں انہیں کا جلا یا ہوا جیا ہوں۔ اور انہیں کی چاکری میں مروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کسی طرح اندیشہ نہ کریں۔ میں مرتے دم تک آپ کا حق نمک ادا کروں گا۔ آپ صرف اتنا کیجیے گا۔ کہ میں جس کا زندہ یا ملازم کی آپ سے شکایت کروں۔ اس کی تنبیہ ضرور کر دیجیے گا۔ ورنہ یہ لوگ شیر ہو جائیں گے۔“

————— (۲) —————

اس حادثہ کے بعد کئی سال تک منشی ست نرائن لال نے اس ریاست کو سنبھالا۔ کبھی کسی معاملہ میں ایک کوڑی کا بل نہیں پڑا۔ سارے ضلع میں انہیں کارسوخ تھا۔ لوگ پنڈٹ جی مرحوم کو بھول سے گئے۔ درباروں میں، کیشیوں میں انہیں کو دعوت ملتی۔ حکام ضلع ان سے اس طرح پیش آتے۔ مگر یادہ زمیندار ہیں۔ ضلع کے دیگر رؤسا ان کا ادب اور لحاظ کرتے۔ مگر روز افزوں وقار اور رسوم کے ساتھ مصارف بھی

بڑھتے جاتے تھے۔ اور بھائی کنور دوسری عورتوں کی طرح جرز رس تھی۔ انسانی طبائع کی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھی۔ پنڈت جی مرحوم ہمیشہ انہیں انعام و اکرام عطا کرتے رہتے تھے اور عنایات کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ روحانی طاقت کے بعد ایمان کا دوسرا ستون نارنج البالی ہے۔ اس کے سوا وہ خود کبھی کبھی کاغذات کی جانچ کر لیا کرتے تھے۔ برائے نام ہی بھی۔ مگر اس سے نگہانی کا خوف بنا رہتا تھا۔ کیونکہ طبی نیابت کے بعد ایمان کا سب سے بڑا دشمن موقع ہے۔ بھان کنور یہ مچھلے نہ جانتی تھی۔ موقع اور احتیاج جیسے ہلکے دشمنوں کے زرعہ میں پڑ کر فتنی کی دیانت کیوں کر جانبر ہو سکتی تھی؟

کان پور شہر سے متصل ایک بہت آباد اور زرخیز موقع تھا۔ عین گنگا کے کنارے، پنڈت جی اس گاؤں کی حسرت لیے ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔ پختہ گھاٹ اور مندر اور باغ اور بنگلہ کی آرزو دل ہی دل میں رہی۔ اتفاق سے اب یہ موضع بیع ہوا۔ اس کے زمیندار ایک ٹھاکر صاحب تھے۔ کسی فوجداری کے معاملہ میں ماخوذ ہو گئے تھے بمقام کی پیردی کے لیے زبردستی کی شد ضرورت تھی۔ منشی جی اپنے منبھی فرائض کے سلسلہ میں کچھری گئے ہوئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے اس کا ذکر کیا، منشی جی کو منہ مانگی مراد ملی۔ اسی وقت مول تول ہوا۔ بیع نامہ لکھا گیا، رجسٹری ہوئی، داخل خارج کی درخواست پیش ہو گئی۔ گورد پے موجود نہ تھے۔ مگر شہر میں ساکھ تھی۔ ایک ہاجن سے رقم لکھ کر بیس ہزار روپے منگوائے۔ اور ٹھاکر صاحب کے نذر کیے۔ ہاں سہولت کے خیال سے یہ سب معاملہ اپنے ہی نام سے طے کیا۔ کیونکہ نابالغوں کے نام سے بیع کرانے میں قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ اور تاخیر سے شکار ہاتھ سے نکل جاتا۔

منشی جی اس دن خوش خوش بیعتنامہ لیے ہوئے بھان کنور کے پاس آئے۔  
 پرزدہ کرایا۔ اور جا کر یہ مرزدہ جانفزا سنایا۔ بھان کنور نے آنسوؤں سے شکر یہ ادا کیا۔  
 پنڈت جی کے نام پر پختہ گھاٹ مندر اور بنگلہ بنوانے کی یاد تازہ ہو گئی منشی سست  
 نرائن لال دوسرے دن اس موقع میں گئے۔ اسامی حاضر ہوئے۔ نذرین گزریں۔ ایک  
 پرتکلف دعوت دی گئی۔ حکام اور روسائے شہر مدعو ہوئے۔ اور کشتیوں کی خوب  
 سیر رہی۔

(۱۴)

حالانکہ اس موقع کو اپنے نام سے خریدتے وقت منشی کے دل میں دغا کا ذرا بھی  
 خیال نہ تھا۔ لیکن دوہی چار دنوں میں اس کے اکھوئے نکل آئے۔ اس موقع کے آمد و  
 خروج کا حساب وہ علیحدہ لکھا کرتے۔ اور اسے اپنی مالکن کو سمجھانے کی مطلق ضرورت  
 نہ سمجھتے۔ بھان کنوریوں بھی ان معاملات میں زیادہ دخل دینا مصلحت کے خلاف  
 سمجھتی تھی۔ اس معاملہ میں بالخصوص اسے منشی کے جذبات کا بہت زیادہ لحاظ تھا۔  
 کہ کہیں انہیں یہ اندیشہ نہ ہو۔ کہ میں ان سے بدگمان ہوں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ ادا ب رفتہ رفتہ دونوں فریق کے دلوں میں چور  
 بیٹھا۔ بھان کنور کو خوف ہوا۔ کہ کہیں یہ سارے کا سارا موقع ہضم کرنے کی فکر میں  
 تو نہیں ہیں۔ ادھر قانونی طاقت منشی جی کے اخلاقی احساس پر غالب آئی۔ انہوں  
 نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ موقع میرا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس ہزار کا مقروض  
 ہوں۔ کوئی بہت کرے گا۔ اپنے روپے بے لے گا۔ اس کے سوا کوئی کیا کر سکتا ہے؟  
 مگر یہ آگ اندر ہی اندر سُنگتی رہی۔ منشی جی پیش قدمی کے انتظار میں مسلح بیٹھے تھے۔



اور بھان کنور موقع کی منتظر تھی۔ ہاں تیر و تفنگ سے محترز رہنا چاہتی تھی۔

ایک روز مناس منشی جی کو اندر بلا کر کہا۔ لالہ جی۔ برگد امیں مندر کا کام کب سے شروع ہوگا۔ اسے لیے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ اب کام لگ جائے تو اچھا ہو۔ زندگی کا کیا اعتبار، جو کام کرنا ہے۔ اسے کمر ہی ڈالنا چاہیے۔“

حملہ کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ منشی جی بھی دل میں اس کے قابل ہو گئے۔ مگر موقع کی زمین نہیں ملتی۔ گنگا کے کنارے کی ساری زمین آسامیوں کی عورت میں ہے۔ اور وہ اسے کسی طرح چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔“

بھان کنور۔ ”یہ بات تو مجھے آج معلوم ہوئی۔ آٹھ سال ہوئے اس گاؤں کا آپ نے کبھی بھولے سے بھی تو ذکر نہیں کیا۔ معلوم نہیں کتنی تحقیق ہے۔ کتنا منافع، کیسا گاؤں ہے، کچھ سیر ہوئی ہے یا نہیں جو کچھ کرتے ہیں، آپ ہی کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ لیکن کچھ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیے،“ منشی جی سنبھل بیٹھے۔ بازار نہ پیش قدمی شروع ہو گئی۔ بولتے آپ کو اس سے کچھ تعلّق نہ تھا۔ اس لیے میں نے خواہ مخواہ آپ کو دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔

بھان کنور کو سکتہ سا ہو گیا پردہ سے باہر ہو گئی۔ اور منشی جی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ نے گاؤں میرے لیے لیا تھا یا اپنے لیے۔ روپیہ میں نے دیا یا آپ نے؟ اس پر چونچر خرچ پڑا، وہ میرا یا آپ کا؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اس وقت ہوش میں ہیں۔“

ست نرائن لال نے سن کر جواب دیا۔ ”یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔ کہ موقع میرے نام سے بیع ہوا۔ روپیہ صرف آپ کا لگا، مگر اس کا میں دین دار ہوں، ہر ماہ تحصیل

دھول کا خرچ، یہ سب میں نے ہمیشہ اپنی جیب سے کیا ہے۔ اس کا حساب کتاب آمد و خرچ ہمیشہ الگ رکھتا گیا ہوں۔“

بھان کنور نے فحشہ سے بل کھا کر کہا: ”اس دغا کا پھل آپ کو ضرور ملے گا۔ یہ اس طرح میرے بچوں کا گلا نہیں کاٹ سکتے۔ جتنے کیا معلوم تھا کہ آپ نے پیٹ میں یہ چھری چھپا رکھی ہے۔ نہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ خیراب سے میرا رڈر اور کاغذات آپ کچھ نہ چھوئیں، میرا جو کچھ ہو گا۔ میں آپ سے ملے لوں گی۔“ یہ کہہ کر بھان کنور پھر پردہ کی اڑ میں آ بیٹھی۔ لالہ صاحب کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ خفیف ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔ اور دفتر میں جا کر کچھ کاغذات اٹل پلٹ کرنے لگے مگر بھان کنور ان کے پیچھے میرے مردانے میں چلی آئی اور ڈانٹ کر بولی۔ میرا کوئی کاغذ مت چھو نا۔ بند بڑا ہو گا۔ تم نہ زہر بھرے ہوئے سانپ ہو۔ میں تمہارا منہ دیکھنا نہیں چاہتی۔“

لالہ صاحب کاغذوں میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خزانہ کی کئی نکال کر پھینک دی۔ یہی کھاتے چلک دیئے کہ اڑ دھڑکے کیساتھ بند کیا۔ اور ہوا کی طرح سن سے باہر نکل گئے۔

دوسرے مختاروں کا رند دل نے یہ کیفیت سنی۔ تو پھوٹے نہ سوائے منشی مت نرائن کے سامنے ان کی دال نہ گلنے پاتی تھی۔ اگر لوگ بد تیل چھڑکنے لگے۔ ”نمک عجیب چیز ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا۔“

طرفین سے مقدمہ بازی کی تیاریاں ہو لگیں۔ ایک طرف قانون کا قالب تھا دوسری جانب قانون کی رُوح مادہ کو رُوح سے پیکار کرنے کا حوصلہ ہوا تھا۔

بھان کنور نے منشی جی چکن لال سے پوچھا۔ ہمارا وکیل کون ہے؟

چھکن لال نے ادھر ادھر جھانک کر کہا: ”ذکیل تو سیٹھ جی تھے۔ مگر ست نرائن لال نے انہیں پہلے ہی گانٹھ رکھا ہے۔ اس مقدمے کے لیے بہت ہوشیار آدمی درکار ہے۔ ہر بابو کی آجکل خوب چل رہی ہے۔ جاکوں کے قلم پکڑ لیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو جیسے موٹر کار جھوٹ گیا۔ جھنور اور کیا کہوں۔ مجرموں کو پھانسی سے اتار لیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی ذکیل تو زبان کھول ہی نہیں سکتا۔ حضور فرمائیں۔ تو انہیں کوکر لیا جائے۔“

اس طو لاتی تمہید کا اثر کچھ نہ ہوا۔ بھان کنور نے کہا ”پہلے سیٹھ جی سے پوچھ لیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ آپ جلیے اور انہیں بلا لائیے۔ چھکن لال نے زیادہ حیل و حجت نہیں کی۔ سیٹھ جی کے پاس جا کر پیغام دیا۔ سیٹھ جی پنڈت بھرگودت کے زمانہ سے یہاں کے قانونی مشیر تھے۔ مقدمہ کی کیفیت سنی تو حیرت میں آگئے۔ ست نرائن لال کو وہ نیک نیت آدمی سمجھتے تھے۔ اسی وقت آئے۔ بھان کنور نے خود ان سے مقدمہ کی روداد بیان کی۔ اور ان پر اپنے بچوں کے بہت حقوق جتانے کے بعد اس معاملے کو فوراً ماتحت میں لینے کی استدعا کی۔ سیٹھ جی نے باہمی مصالحت کا ذکر کیا۔ بھان کنور پھر پردہ کے باہر نکل آئی، اور بولی نہیں کبھی نہیں۔ میں صلح نہ کروں گی۔ آپ کا غناظ دیکھیں۔ میرے بچوں کی خاطر تکلیف اٹھائیں۔ ست نرائن کی نیت پہلے خراب نہ تھی، تھوڑے دنوں سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ دیکھئے جس تاریخ کو گاوٹ بیع ہوا تھا۔ اس مہتی میں ۳۲ ہزار کا خرچ دکھایا گیا ہے۔ اس نے اپنے نام قرض لکھا ہو تو ذرا دیکھئے۔ سالانہ سود ادا ہوا یا نہیں۔ ایسے دغا باز آدمی سے میں صلح کروں گی؟“

اس میں کچھ نکتہ ہو یا نہ ہو۔ مگر جو عورت کبھی ان معاملات کے قریب نہیں گئی۔ اس کی قانونی گرفت واقعی حیرت انگیز تھی۔ یہ اس دھن کی برکت تھی۔ جو اس وقت بھان کنور کے سر پر سوار تھی۔ خلاصہ یہ کہ کاغذات کی جانچ ہوئی۔ ثبوت بہم کیے گئے۔ اور استغاثہ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

(۴)

منشی مست نرائن لال غصہ میں بھرے ہوئے مکان پر پہنچے۔ رٹ کے نے سٹھائی کے لیے ضد کی۔ اسے پیٹا۔ بیوی پر اس لیے برس پڑے کہ اس نے کیوں رٹ کے کو رلایا۔ اپنی بوڑھی ماں کو ڈانٹا۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ رٹ کے کو بہلاؤ۔ اب میں گھر پر آؤں تو بیٹھ کر رٹ کے کو کھلاؤں مجھے دنیا میں نہ اور کوئی کام ہے، نہ اور کوئی فکر۔ اس طرح گھر میں ایک طوفان برپا کر کے وہ باہر آئے۔ اور سوچنے لگے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اتنے دنوں تک سارے کاغذ اپنے ہاتھ میں تھے۔ جو چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ آج جب سر پر آپڑی تو سوچھی۔ میں چاہتا تو نئے ہی کھاتے بنا سکتا تھا۔ جس میں اس گاؤں کے روپے کا خرچہ کا ذکر ہی نہ ہوتا، افسوس! گھر میں آئی ہوئی لکشی میری حماقت اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت اٹھی جات ہے۔ مگر مجھ کیا معلوم تھا۔ کہ وہ شیطان کی خالہ اس طرح مجھ سے پیش آئے گی کہ کاغذات کو ہاتھ تک نہ لگانے دے گی۔

اسی ادھیڑ میں پڑے پڑے یکایک منشی جی اچھل پڑے۔ ایک ترکیب سوچہ گئی۔ کیوں نہ کار پر وارڈوں کو ملاؤں۔ وہ سب کے سب میری سخت گیرلوں کی بدولت مجھ سے ناراض تھے۔ اس وقت سیدھے منہ مجھ سے بات نہ کریں گے۔ پر ان

میں ایسا تو کوئی نہیں ہے۔ جو زر سے بے نیاز ہو۔ ہاں اس میں صرف کثیر کی ضرورت ہوگی۔ مگر اتنا دوسرے آئے گا کہاں سے۔ کاش ذرا پہلے چیت گیا ہوتا۔ تو یہ سب وقتیں ایک بھی نہ ہوتیں۔ بس ایک ہی ترکیب ہے۔ کسی طرح دو کاغذات غائب کر دوں۔ خطرناک معاملہ ہے۔ پر کرنا ہی پڑے گا۔

نفس کے سامنے ایک بار سر جھکانے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی اتھاہ ندی میں ایک بار پھسل کر ہم دم بہ دم پیچھے ہی ہوتے جاتے ہیں منشی ست زائن لال جیسانیک آدمی اس وقت اس نکر میں تھا کہ کیونکر سینڈ لگاؤں۔ گناہ کی غذا گناہ ہے۔ منشی جی نے سوچا کیا سینڈ لگانا آسان ہے؟ اس میں کتنی ہمت، کتنی ہوشیاری، کتنی پھرتی اور صفائی کی ضرورت ہے۔ کون کہتا ہے کہ چوری آسان کام ہے۔ اور کہیں اگر پکڑا گیا، تو پھر مجر ڈوب مرنے کے اور کوئی علاج نہیں منشی جی کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا۔ کہ وہ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں ہاں ایک ترکیب اس سے آسان نظر آئی۔ کیوں نہ دفتر میں آگ لگا دوں۔ ایک بوتل مٹی کے تیل اد۔ ایک دیاسلانی کی ضرورت ہے۔ کسی بد معاش کو ملا لوں۔ اس کی مدد سے کام ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کیا معلوم کہ وہ بھی اس کمرہ میں رکھی ہے یا نہیں۔ اس چڑیل نے ضرور اسے اپنے پاس رکھا ہوگا۔

منشی جی اسی ادھیڑ بن میں کڑوٹیں بدلتے رہے۔ نئے نئے منصوبے سمجھتے مگر پھر اپنی ہی دلیلوں سے انہیں مٹا دیتے۔ جیسے برسات میں آسمان پر بادلوں کی نئی نئی صورتیں بنتی اور پھر ہوا کے زور سے بگڑ جاتی ہیں۔

لیکن یہ خیال دل سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ کہ ان کاغذات کو اپنے ہاتھ

میں لانا چاہیے۔ یہ کام کٹھن ہے۔ مانا، پر ہمت نہ تھی۔ تو رڈ کیوں مول لی تھی؟ کیا کسی کی ۲۰ ہزار کی جائیداد آسانی سے ہاتھ آجائے گی؟ خواہ کسی صورت سے ہو۔ چور بنے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ آخر جو نوگ یہ کام کرتے ہیں۔ وہ بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں۔ بس ایک جھلناک کا کام ہے۔ اگر پیار ہو گئے، تو راج کریں گے۔ اگر گھر پڑے تو جان سے ہاتھ دھوئیں گے۔

اس طرح منشی ست نرائن نے اپنا دل مضبوط کیا۔

(۵)

رات کے دس بج گئے تھے۔ منشی ست نرائن لال کتھیوں کا ایک گچھا کر میں دبائے گھر سے باہر نکلے۔ دروازہ پر مقوڑے سے پیال رکھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونک پڑے۔ مادے خوف کے کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی چھپا بیٹھا ہے۔ ان کے قدم رک گئے۔ پیال کی طرف نور سے دیکھا اس میں مطلق حرکت نہ ہوئی۔ تب ہمت بندھ گئی۔ آگے بڑھے اور دل کو سمھانے لگے میں کیسا احمق ہوں۔ اپنے دروازہ پر کس کا خوف۔ راستہ ہی میں مجھے کس کا خوف ہے۔ میں اپنی راہ جاتا ہوں۔ کوئی میری طرف ترجھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا ہاں جب مجھے کوئی عین موقع پر پکڑ لے تو البتہ، دفعۃً انہوں نے بھان کنور کے ایک چٹراسی کو آتے دیکھا۔ کلیجہ سن سے ہو گیا۔ وہ لپک کر ایک اندھیری گلی میں گھس گئے۔ اور ہاں بڑی دیر تک کھڑے رہے۔ جب وہ پیال ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر سڑک پر آئے۔ پیاسی آج صبح تک ان کے حکم کا غلام تھا اسے انہوں نے بار گالیاں دی تھیں۔ لائیں بھی ماری تھیں۔ مگر آج اس کی صورت دیکھ کر ان کی روح فنا

ہو گئی۔

انہوں نے پھر دلیل کی پناہ لی۔ میں جیسے بھنگ لکھا گیا ہوں۔ اس چپڑا سی سے اتنا ڈرا۔ باافرض وہ مجھے دیکھ ہی لیتا تو میرا کیا کر سکتا تھا؟ ہزاروں آدمی راستہ پر چل رہے ہیں۔ انہیں میں ایک میں بھی ہوں۔ کیا دیکھنے والوں کا حال دیکھتے نکلا ہے؟ غالباً مجھے دیکھ کر وہ ادب سے سلام کرتا۔ اور کچھ دور تک میرے ساتھ چلتا۔ عجب نہیں کہ آج وہاں کی داستان بیان کرتا ہوں۔ اس طرح دل کو مضبوط کر کے وہ پھر آگے بڑھے۔ یہ شاید صبح ہے کہ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتا ہے۔ جو ہوا کے جھونکے میں گر پڑتا ہے۔ بازار میں پہنچے، زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ان میں گانڈ اور گائیں بیٹھے ہوئے رز و کٹاؤں کر رہے تھے۔ صرف حلوائیوں کی دکانیں کھلی تھیں۔ اور کہیں کہیں ایک آدھ گجرے والے ہار کی ہانک لگاتے پھرتے تھے۔ یہ حلوائی مفتی جی کو پہچانتے تھے۔ مگر مفتی جی نے سر نہ اٹھایا۔ کچھ رفتار تبدیل کی۔ اور پلکتے ہوئے چلے، دفعتاً ایک لکھی آتی ہوئی دکھائی دی انہوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بلبھ داس سیٹھ وکیل کی لکھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ ہزاروں بار سیٹھ جی کے ساتھ کچہری گئے تھے۔ پر آج یہ انہیں کالے دریو کی طرح خوفناک معلوم ہوئی۔ انہوں نے رخ پھیر لیا۔ اور بھاگ کر ایک خالی دکان پر چڑھ گئے۔ ساند نے سمجھا کوئی پیار قیب پیدا ہوا ہے۔ سینک جھکائے پھنکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پر اس انتشار میں لکھی نکل گئی۔ اور مفتی جی کی جان میں جان آئی اب کے انہوں نے دلیلوں سے دل کو نہ سمجھایا۔ سمجھ گئے کہ اس وقت اس سے کوئی سود نہیں۔ خیریت ہو گئی کہ وکیل نے دیکھا نہیں۔ ورنہ ایک ہی گھاگ سے میرے

بشرے سے تالچا جاتا۔ ایک نر لانگ چل کر ایک گلی ملی۔ یہی بھان کنور کے مکان کا راستہ تھا۔ ایک دھندلی سی لائٹیں روشن تھیں۔ جیسا منشی جی نے قیاس کیا تھا۔ بہرہ دار کا پتہ نہ تھا۔ اصطبل میں چاروں کے یہاں نالاج ہو رہا تھا۔ کئی چارہ بین بناد منکار کر کے نالاج رہی تھیں۔ چارہ مردنگ بجایا کرتے تھے۔

گھر پر نہیں مائیں شیاں گھیر آئے بدرا

اور دونوں پہرہ دار وہاں تماشا دیکھ رہے تھے۔ منشی جی کے کلبجی میں دھڑکن تھی۔ سردھم کرتا تھا۔ ہاتھ پادریں کانپ رہے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔ بدن بدن کا ایک ایک رویاں آنکھ اور کان بنا ہوا تھا۔ ان کی ساری طاقت اور سبقتی اور اوسان اور حواس اور احتیاط اس وقت ارادہ کی مدد پر مستعد تھیں۔

منشی جی بلی کی طرح دبے پاؤں لائٹن کے پاس گئے۔ اور جس طرح وہ چوہے پر چھپتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے جھپٹ کر اس کا پیٹ کھولا۔ اور اسے گل کر دیا ایک مرحلے ہو گیا۔ مگر جتنا سمجھتے تھے اتنا مشکل نہ تھا۔ دل کچھ مضبوط ہوا۔ دفتر کے برآمدے میں پہنچے۔ اور ایک لمحہ تک خوب کان لگا کر آہٹ لی۔ چاروں طرف سنانا تھا۔ صرف چاروں کے گانے کی آواز کان میں آتی تھی۔ دروازہ پر وہی پیرانا نقل تھا۔ اس کی کبھی آج بہت تلاش کر کے بازار سے خرید لائے تھے۔ نقل کھل گیا۔ کواڑوں نے بہت ہی دبی زبان سے حدائے احتجاج بلند کی۔ منشی جی دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کے اعصاب میں اس وقت بندر کی سی پھرتی اور چستی تھی۔ اندر چراغ جل رہا تھا۔ منشی جی کو دیکھ کر اس نے ایک بار سر ہلایا۔ گویا انہیں اندھے آنے کی ممانعت کی۔



منشی جی کے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ایڑیاں زمین سے اُچھلی پڑتی تھیں۔ سانس سینہ کو پھوڑ کر نکلتا چاہتا تھا۔ گناہ کا اتنا سنگین بار انکی برداشت سے باہر تھا۔

پہلے بھر منشی جی نے بیٹوں کو الٹا پلٹا، ان کی تحریر آنکھوں میں تیرتی نہ تھی۔ انتخاب کی ہمت نہ تھی۔ انہوں نے کاغذات کا ایک پشتلہ باندھا۔ اور بعل میں دبا کر تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازہ کو آہستہ سے بند کیا۔ اور اس باپ کی گھڑی کو لیے ہوئے اندھیری گلی میں غائب ہو گئے۔

تنگ اندھیری متعفن گلیوں میں وہ برہنہ پاتری سے قدم بڑھاتے ہوئے اس طمع خود غرضی بے وفائی اور دغا کا بارگراں لیے ہوئے چلے جاتے تھے۔ گویا گناہوں سے لدی ہوئی روح دوزخ کی نالیوں میں ہی جاتی تھی۔

بہت دیر تک بھٹکتے کے بعد وہ گنگا کے کنارے پہنچے جس طرح تاریک دلوں میں کہیں کہیں ایمان کی دھندلی روشنی چھپی رہتی ہے۔ اسی طرح ندی کی سیاہ اند ساکت سطح پر تارے بھٹکتا رہے تھے۔ کنارے پر چند سادھو دھونی رملے ہوئے تھے۔ شعلہ حقیقت دل کی بجائے باہر دھک رہا تھا۔ منشی جی نے اپنا پشتارا اتارا۔ اور چادر میں لپیٹ کر اسے ندی میں پھینک دیا۔ سوئی ہوئی ہروں میں کچھ بچل ہوئی۔ اور سناٹا ہو گیا۔

— (۶) —

منشی ست نرائن لال کے گھر میں ان کی ماں اور بیوی دو عورتیں تھیں۔ تاہم منشی جی کو گنگا میں ڈوب مرنے یا کہیں بھاگ جانے کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں

عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ نہ وہ باڈیز پہنتی تھیں۔ نہ موزے، نہ ہار مونیم پر  
 گا سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں صابن کے استعمال تک کا علم نہ تھا۔ وہ بالوں  
 میں میرین (Hair Pin) لگانا تک نہ لگانا جانتی تھیں۔ یہو میں اپنی عزت کا ذرا  
 بھی احساس نہ تھا۔ نہ ساس میں خود داری کی اسپرٹ، بہو اب تک ساس کی  
 گھرکیاں بھیگی بلی کی طرح سہہ لیتی تھی۔ ساس کو بچوں کے ہنسلانے دھلانے حتیٰ کہ  
 گھر میں جھاڑو دینے تک سے عار نہ تھا۔ بہو عورت کیا مٹی کا لوندا تھی۔ ایک  
 پیسہ کی بھی ضرورت ہو تو ساس سے مانگتی۔ غرض دونوں عورتیں اپنے حقوق سے  
 بے خبر جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی جانوروں کی طرح زندگی کے دن کاٹی تھیں۔  
 ایسی پھوٹڑ تھیں۔ کہ دل موٹ، سمو سے وغیرہ بھی گھر ہی میں بنا لیتی تھیں۔ اپنے  
 ہی ہاتھوں سے کتنی ہی جسمانی شکایتوں کا علاج بھی کر لیتی تھیں۔ بیٹھی گھاس پات  
 بوٹا کرتی تھیں۔ منشی جی نے ماں کے پاس جا کر کہا۔ ”اماں! کچھ روپیہ نکالو مجھ سے  
 بھان سے ان بن ہو گئی۔ کل انہوں نے مجھ سے قصور الگ کر دیا۔ ناں نے چونک کر  
 پوچھا۔ ”الگ کر دیا! کیا بات ہوئی؟ بھان کنور کا مزاج تو ایسا نہ تھا۔“

منشی۔ بات کچھ نہیں تھی۔ میں نے اپنے نام سے جو موضع لیا تھا۔ اُسے میں  
 نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ کل مجھ سے اُن سے صاف صاف باتیں ہوئیں میں نے  
 کہہ دیا کہ گاؤں کا فیصلہ ہے۔ میں نے اپنے نام سے لیا ہے۔ اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں  
 بس جاہ سے باہر ہو گئیں۔ جو جی میں آیا بکتی رہیں۔ اسی وقت مجھے نکال دیا، اور  
 کہا میں تم سے لڑ کر اپنا گاؤں لے لوں گی۔ اب آج ان کی طرف سے میرے ادب پر  
 مقدمہ دائر ہو گا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرا اس پر قبضہ ہے۔ ایک نہیں ہزار

مقدّمے چلائیں، ڈگری میری ہوگی۔

ماں نے بہو کی طرف دیکھا۔ بہو نے ماں کی طرف تاکا۔ ماں بولیں کیوں بیٹا؟ وہ گاؤں تو تم نے انہیں کے روپے سے انہیں کے لیے لیا تھا؟

مہنتی - لیا تھا تب لیا تھا۔ اب مجھ سے ایسا آباد زرخیز گاؤں نہیں چھوڑا جاتا وہ میرا کچھ نہیں کر سکتیں۔ اپنے روپیہ کی وصولیابی کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ڈیڑھ سو گاؤں تو ہیں۔ تب بھی ہوس نہیں مانتی۔

ماں - بیٹا کسی کے دھن ہوتا ہے۔ تو وہ اسے پھینک تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تم نے اپنی نیت خام کی۔ یہ اچھا نہیں کیا۔ دنیا تم کو کیا کہے گی؟ اور دنیا چاہے، کچھ کہے یا نہ کہے۔ بھلا تم کو ایسا چاہئے۔ کہ جس کی گود میں اتنے دن پلے۔ جس کا اتنے دنوں تک نمک کھایا۔ اب اسی سے دغا کرو۔ نارائن نے تمہیں کیا نہیں دیا ہے؟ بڑے سے کھاتے ہو، پہنتے ہو۔ گھر میں نارائن کا دیا چار بیٹے ہیں، بال بچے ہیں۔ اور کسی کو کیا چاہیئے؟ میرا کہنا مانو، یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے نہ لگاؤ۔ یہ آجس مت لو۔ برکت اپنے ہی پسینہ کی کمائی ہوتی ہے۔ حرام کی کوڑی کبھی نہیں پھلتی۔

مہنتی - یہ سب باتیں پوچھتی کے بیگن ہیں۔ دنیا ان پر چلنے لگے۔ تو سارا نقصان بگڑھ جائے۔ میں نے اتنے دنوں ان کی خدمت کی۔ ایسے اپنے چار پانچ گاؤں میری ہی بدولت بڑھ گئے۔ جب تک پنڈت جی زندہ تھے۔ میری نیت کی قدر کی۔ آنکھ میں دھول ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود ہی میری خاطر کر دیا کرتے انہیں مرے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ مگر مساقہ کے ایک بیڑے پان کی بھی قسم کھاتا ہوں۔ میری ذات سے ان کی ہزاروں روپے ماہوار کی بچت ہوتی تھی۔ کیا ان

کو اتنی سمجھ نہیں تھی کہ یہ شخص جو اتنی ایمانداری سے میرا کام کرتا ہے۔ اس نفع میں  
 کچھ اس کا بھی حق ہے یا نہیں۔ حق کہہ کر نہ دو۔ انعام کہہ کر دو کسی طرح دو تو مگر وہ  
 سمجھی تھیں کہ میں نے اسے دس روپے بہینہ پر مول لے لیا ہے۔ میں نے آٹھ سال تک  
 صبر کیا۔ اب کیا دس روپے میں زندگی بھر غلامی کیا کروں۔ اور اپنے بچوں کو دوسروں  
 کا منہ تاکنے کے لیے چھوڑ جاؤں؟ مجھے یہ موقع ملا ہے۔ اسے کیوں چھوڑ دوں؟ زمینداری  
 کی ہوس یہ کیوں مروں؟ جب تک زندہ رہوں گا خود کھاؤں گا۔ میرے بعد  
 میرے بچے چین اڑائیں گے۔ "ماں کی آنکھوں میں آنسو بھرائے۔ بولیں، بیٹا! میں نے  
 تمہارے منہ سے ایسی باتیں کبھی نہ سنی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے آگے  
 بال بچے ہیں۔ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو، بیوی نے ساس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ایسا دھن  
 نہ چاہیے۔ ہم اپنی روٹی دال میں خوش ہیں۔"

منشی۔ اچھی بات ہے۔ تم لوگ روٹی کھانا، گڑی گاڑھا پہننا مجھے اب  
 حلوے پوری کی خواہش ہے۔

مال۔ یہ ادھر م مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ میں گنگا میں ڈوب مروں گی۔  
 بیوی۔ تمہیں یہ کانٹے بونا ہے۔ تو مجھے میکے میں پہنچا دو۔ میں اپنے بچوں  
 کو لے کر اس گھر میں نہ رہوں گی۔

منشی نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم لوگوں کی عقل تو بھنگ کھا گئی ہے۔ یہ سب سرکاری  
 ملازم رات دن دوسروں کا گلا دبا دبا کر رشتہیں لیتے ہیں۔ اور چین کرتے ہیں۔  
 نہ ان کے بال بچوں ہی کو کچھ ہوتا ہے نہ ان کو، ادھر م ان کو کیوں نہیں کھا جاتا۔ جو  
 مجھ ہی کو کھا جائے گا۔ میں نے تو ایمانداروں کو ہمیشہ تکلیف ہی میں دیکھا۔ میں

نے توجہ کیا ہے۔ اس کا سکھ اٹھاؤں گا۔ تم لوگوں کے جی میں جو آئے کرو۔

(۷)

صبح کے وقت بھان کنور کا دفتر کھلا تو کاغذات سب غائب تھے ہنستی چھین لال بدحواس گھر میں گئے۔ اور مالک سے پوچھا، کاغذات کیا آپ نے اٹھوائے ہیں؟ بھان کنور نے کہا، مجھے کیا خبر، جہاں آپ نے رکھے ہوں گے، وہیں ہوں گے۔ دم کے دم میں سارے گھر میں طوفان مچ گیا، پہرہ داریوں پر مار پڑنے لگی۔ بھان کنور کو معاست نرائن لال پر شبہ ہوا۔ مگر ان کے خیال میں چھکن لال کی مدد کے بغیر کام ہونا غیر ممکن تھا۔ پولیس میں رپٹ ہوئی۔ ایک ادجھا نام نکالنے کے لیے بلایا گیا۔ مولوی صاحب نے قریب پھینکا۔ ادجھانے بتلایا کسی پرانے دشمن کا یہ کام ہے مولوی صاحب نے بتلایا کسی گھر کے بھیدی نے یہ حرکت کی ہے۔ شام تک یہی دوڑ دھوپ رہی۔ اور تب یہ صلاح ہونے لگی کہ ان کاغذات کے بغیر مقدمہ کیونکر چلے گا۔ مرد داد پہلے ہی کمزور تھی جو کچھ سہارا تھا، انہیں اندراجات کا تھا۔ جو خود ہنستی ست نرائن لال نے کیے تھے۔ اب تودہ ثوب بھی ہاتھ سے گئے۔ دعویٰ میں کچھ جان ہی نہیں باقی رہی۔ مگر بھان کنور نے مقدمہ دار کرنے پر زور دیا۔ بلا سے مار جائیں گے۔ ہماری چیز کوئی دوسرا چھین لے تو ہمارا دھرم ہے۔ کہ اس چیز کو واپس لینے کے لیے اپنے قابو بھر لڑیں۔ مار مان کر بیٹھ رہنا بزدلی کا کام ہے۔ سیٹھ جی وکیل کو اس سانحہ کی اطلاع دی گئی۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ مقدمہ بالکل بے جان ہو گیا۔ صرف عقلی اور قیاسی دلیلوں پر دار و مدار ہے۔ عدالت نے تسلیم کیا تو کیا، ورنہ مارنا پڑے گا۔ یہ بھان کنور کو غصہ تھی کہ مقدمہ

ضرر دامن ہو۔ کھنڈ اور الہ آباد سے دو بلند بانگ بیرسٹر بلائے گئے۔ اور ایک ہفتہ کے اندر استغاثہ دامن ہو گیا۔

سارے شہر میں اس مقدمہ کی دھوم تھی۔ کتنے ہی روسا کو بھان کنور نے شہادت میں طلب کیا تھا۔ دل چسپی کا خاص سبب یہ تھا کہ بھان کنور خود بھی پردہ کی آرٹیں بیٹھی ہوئی رو داد سنتی تھی۔ کیونکہ اسے اب اپنے ختماروں اور ملازموں پر بھروسہ نہ تھا۔

استغاثہ کے بیرسٹر نے ایک مدلل اور مؤثر تقریر کی۔ اس نے منشی ست نرائن لال کی سابقہ دیانت اور خلوص نیت اور ان پر پنڈت بھرگودت کے کامل اعتماد کا ذکر کیا۔ بعد ازاں یہ دکھایا کہ مدعا علیہ کی مالی حالت ہرگز ایسی نہ تھی۔ جسے اتنے صرف کثیر کی متحمل ہو سکتی۔ آخر میں اس نے منشی جی کی دغا اور بد بھدی پر ایسے رقت آمیز پیرایہ میں بحث کی کہ سامعین کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ ”کتنے افسوس اور ہمت کا مقام ہے۔ کہ ایسا نادار آقا پرست آدمی رفتہ رفتہ اتنا گر جائے۔ کہ اس کی بے کس بیوہ اور یتیم بچوں کی گردن پر چھری پھرنے سے باز نہ آئے۔ جن کا ننگ ان کی ہڈیوں میں بیوست ہو گیا ہے۔ انسانی خباثت اور کج روی کی اس سے زیادہ ہمت ناک مثال نہیں مل سکتی۔ نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تو اس شخص کی سابقہ دیانت اور وفا کی وقعت بالکل نہیں باقی رہتی۔ کیونکہ وہ جواہر نہ تھے۔ بلکہ سنگریزے تھے جو محض اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے۔ پیش کیے گئے تھے۔ وہ محض ایک رنگین جال تھا۔ جو ایک خوش اعتقاد اور کم اندیش رئیس کو پھنسانے کے لیے پھیلایا گیا تھا۔ خیال کیجیے کہ اس شخص کا باطن کتنا تاریک گہرا اور اس

کی خیانت کتنی دور رس ہے! اپنے حریف کے ساتھ دغا کرنا کسی حد تک معافی کے قابل ہے۔ مگر اس شخص نے ان بے کسوں کے ساتھ دغا کیا ہے جن کے ساتھ یہودی کہہ کر انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ کاش ہمارے ہاتھ میں اندراجات ہوتے۔ جو بیجانہ لکھانے کے وقت منشی صاحب ممدوح نے فرمائے تھے۔ تو عدالت پر ان کی سیر باطنی روشن ہو جاتی مگر ان کا دفتر سے عین برخاستگی کے روز غائب ہو جانا بھی عدالت کے لیے کچھ کم یقین انگیز نہ ہونا چاہیے۔ ایسی رذالت کے بعد اس شخص کے نزدیک کوئی کام ناکردنی نہیں ہو سکتا۔

کئی روز تک شہر کی شہادتیں ہوئیں۔ مگر بیشتر سماعی تھیں۔ دو ایک صاحبوں نے چشم دید شہادت کا دعویٰ کیا۔ پر جرح میں اکھڑے ہوئے۔

آج کی کارروائی ختم ہو گئی۔ دوسرے دن پھر مقدمہ پیش ہوا۔

مخالف فریق کے دکیل صاحب نے جوابی تقریر کرنا شروع کی جس میں تضحیک کا پہلو غالب تھا۔ یہ نرالی منطق ہے۔ کہ ایک دولت مند کا ملازم جو کچھ خریدے وہ اس کے آقا کی چیز ہے۔ اس دلیل کے مطابق ہماری گورنمنٹ کو اپنے ملازمین کی جائداد پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ یہ تسلیم کرنے میں ہم کو عذر نہیں کہ ایسی کثیر رقم ہماری دسترس سے باہر تھی۔ ادھر یہ رقم ہم نے اپنے آقا ہی سے قرض لی۔ مگر بجائے اس کے کہ ہم سے قرضہ کی وصولی کا تقاضا کیا جاتا۔ ہم سے وہ جائداد مانگی جاتی ہے۔ حساب کے کاغذات پیش کیے جائیں۔ تو وہ صاف بتلا دیں گے کہ اب میرے ذمے بھان کنور کا ایک جہہ بھی باقی نہیں ہے۔ اگر میں آپ سے قرض لے کر اپنی شادی کر لوں تو کیا کل آپ مجھ سے میری بیوی کو چھین لینے کا دعویٰ کریں گے؟ ہمارے روشن

خیال دوست نے ہمارے اوپر بے کسوں اور یتیموں کے ساتھ دغا کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اگر منشی ست نرائن لال کی نیت ناسد ہوتی۔ تو اس کا بہترین موقع وہ تھا۔ جب اس کے آقائے نامدار کی وفات ہوئی تھی۔ اس طولانی انتظار کی کیا ضرورت تھی؟ اگر آپ شیر کو پھنسا کر اس کے بچے کو اسی دقت نہیں بکڑھاتے بلکہ اسے بڑھنے اور خوشخوار ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ تب مجھے آپ کے دماغ کے صحیح ہونے پر شبہ ہوگا۔ مگر شاید منشی ست نرائن لال کے رنگین جال میں کوئی ایسی کرامات ہو۔ جسے سمجھنے میں ہمارے عالم دوست قاصر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی جی نے حق نمک ادا کر دیا۔ آٹھ سال تک کمال دیانت سے کام انجام دیا۔ اور آج انہیں اپنی نیک نیک نیتی کا ثمرہ جو مل رہا ہے۔ وہ نہایت درجہ دلہندہ اور جگر خراش ہے۔ اس میں بھان کنور کی کوئی خطا نہیں۔ وہ ایک نیک خاتون ہیں۔ مگر اپنی صنف کی اعتقادی کمزوریوں سے خالی نہیں۔ دیا مندر آدمی خاصہ صفا گو اور کم سخن ہوتا ہے۔ اسے باتوں میں نمک مرزج ملانے اور تندہ شکر گھولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی باعث ہے کہ پنڈت جی کی بیوہ پر شیریں بیان رقیبوں کو وار کرنے کا یہ موقع مل گیا۔ اس دعویٰ کی بنیاد صرف اتنی ہے، اور کچھ نہیں۔ بھان کنور یہاں موجود ہیں۔ کیا وہ کہہ سکتی ہیں۔ کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں کبھی اس موضع کا ذکر انہوں نے کیا۔ کبھی اس کے نفع نقصان، آمد و خرچ یا لین دین کا چرچا ان سے کیا گیا۔ میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ اگر میں آج دفتر میں آکر اپنے خانگی انتظامات کی داستانیں چھیڑوں۔ اپنے اخراجات کی زیادتی اور اپنے خدمت گار کی نیکیوں کا قصہ گانے لگوں۔ تو شاید مجھے بہت جلد اپنے ہمد سے سے سبکدوش ہونا پڑے۔



اور ممکن ہے کچھ دنوں بنارس کے شاندار مہمان خانہ میں رکھا جاؤں؟  
 اس کے بعد متعدد شہادتیں پیش ہوئیں: بالخصوص قرب وجوار کے  
 مواضع کے لوگوں کی جہنوں نے بیان کیا کہ انہوں نے منشی ست نرائن لال کو  
 اپنے دستخط سے رسیدیں دیتے اور اپنے ہی نام سے خزانہ میں روپیہ داخل کرتے  
 دیکھا ہے۔ اس موقع کا دفتر اسی جگہ تھا۔ اس میں منشی جی کی سیر بھی ہوتی ہے۔  
 وغیرہ۔

اس کاروائی کے بعد شام ہو گئی۔ منصف عدالت نے کل فیصلہ سناتے کا  
 وعدہ کیا۔

---

مشی رست نرائن کی فتح اب یقینی تھی۔ استغاثہ کی شہادتیں کمزور تھیں۔ بحث قیاسی دلیلوں پر مبنی۔ ان کے منصوبے اب پورے ہونے والے تھے۔ ان کا شمار بھی زمینداروں میں ہو گا۔ اور اپنی سعی و محنت سے بہت جلد وہ بھی رو سا کے زمرہ میں شامل ہو سکیں گے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ اب شہر کے شرفاء سے آنکھیں ملاتے شرما تے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ان کا سر نیچا ہو جاتا تھا۔ اور وہ بازار میں نکلتے تو انہیں دیکھ کر اکثر دکانداروں میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ اور لوگ ان کی طرف بڑی نگاہوں سے دیکھتے اس لئے وہ بازار سے سر جھکائے قدم بڑھاتے جاک نکلتے تھے اب تک لوگ انہیں ایک سچا بے لوث اور پاک طینت شخص سمجھتے تھے شہر کے و مندر اور شریف لوگ انہیں اعزاز کی رنگاہوں سے دیکھتے اور بڑی خاطر سے پس آتے حالانکہ ابھی منشی جی کو آزمائش کا موقع نہیں ملا تھا۔ پران کا دل کہتا تھا کہ میری وہ بات نہیں رہی۔ اصل حقیقت سارے زمانہ پر روشن ہے۔ اور عدالت میرے حق میں فیصلہ ہی کیوں نہ کر دے۔ لیکن میری ساکھ اب باقی رہی دلوں سے میری عزت اٹھ گئی۔ اب مجھے بھی لوگ خود غرضی ریاکار مطلبی سمجھیں گے۔

غیروں کی تو بات الگ راہی۔ خود ان کے گھر والے ان کے شریک نہیں تھے۔ بوڑھی ماں نے تین دن سے منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ اور بیوی بار بار ماتھے جوڑ کر کہتی کہ ”اچھے بچوں پر رحم کرو۔ بڑے کام کا پھل کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہیں تو پہلے مجھے کوڑہر دے دو“

فیصلہ کے دن صبح کو ایک کنجور ٹن سبزی لے کر آئی۔ منشاٹن سے بولی  
 ”بہوجی! ہم نے بजार میں ایک بات سنی ہے۔ بُرا نہ مانو تو کہوں۔ جس کو دیکھو  
 اس کے منہ میں یہی بات ہے کہ لالہ بابو نے جال سا جی سے پنڈتائن کا الاکا لے  
 لیا ہے۔ ہمیں تو اس پر اکین کبھی نہیں آتا۔ لالہ بابو نے سنبھالا ہوتا۔ تو اب تک  
 پنڈتائن کی ایک انگل زمین نہ بچتی۔ انہیں کا ایسا جگر تھا کہ سب کو سنبھال لیا  
 تو اب کیا انہیں کے ساتھ بدی کر نیکی؟ اسے بہو! کوئی کچھ ساتھ لاتا ہے کہ لے  
 جائے گا۔ یہی نیکی بدی رہ جاتی ہے بُرے کا پھیل بُرا ہی ہوتا ہے۔ آدمی نہ دیکھے  
 پر اللہ سب کچھ دیکھتا ہے“

بہوجی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو اس میں  
 سما جاؤں۔ عورتوں میں عزت اور حیا بہت زیادہ ہوتی ہے۔ طعن و تشنیع کی  
 برداشت اُن سے نہیں ہو سکتی سر جھکائے ہوئے بولی۔ ”لو! میں ان باتوں کو کیا  
 جانوں۔ میں نے تو یہ بات آج تمہارے منہ سے سنی ہے۔ کون کونسی ترکاری  
 ہے؟“

غشی ست نرائن لال بھی اپنے کمرے میں پڑے کنجور ٹن کی یہ باتیں سن  
 رہے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ بیوی کے پاس آکر پوچھنے لگے۔ ”یہ  
 کیا کہہ رہی تھی؟“

بیوی نے شوہر کی طرف سے منہ پھیر کر زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا تم نے نہیں سنا؟ تمہارے کتب کا مکھان کر رہی تھی۔ تمہاری بدولت  
 دیکھیں کس کس کے منہ سے یہ باتیں سُنا پڑتی ہیں۔ اور کس کس سے منہ چھپا پڑتا ہے؟“

فشی جی اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ بیوی کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ دل پر  
 بغیر کا غلبہ ہو گیا۔ جس شخص کی نیک نیتی کی سارے شہر میں دھوم ہو جو ہمیشہ  
 غرور سے گردن اٹھا کر چلتا تھا ہو جو ہمیشہ اعزاز و احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا  
 ہو وہ کبھی زبان غلق سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ بدنامی کا خوف ہی بد نیتی کا سب  
 سے بڑا دشمن ہے۔ فشی جی نے سمجھا تھا۔ میں اس فعل کو ایسے خفیہ طریق سے کر لوں  
 گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اور میرے اعتبار میں ورہ مبر بھی فرق نہ آئے  
 گا ان کی یہ آرزو تو پوری نہ ہوتی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان مشکلات کے دور  
 کرنے میں انہیں چوری تک کرنا پڑی۔ لیکن یہ سب اسی بدنامی کے خوف سے جس  
 میں کوئی یہ نہ کہے۔ کہ اپنی مالکہ کو دھوکا دیا۔ باوجود اس احتیاط کے وہ رسوائی  
 کے نازیبا نہ سے نہ بچ سکے۔ بازار کی سودا بیچنے والی عورتیں تک اب انہیں  
 ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ پہنچہ نفس میں دبا ہوا ایمان اس صدمہ کو  
 برداشت نہ کر سکا فشی جی سوچنے لگے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مانا کہ میں  
 صاحب جابداد ہو جاؤں گا۔ لیکن بدنامی میرے گلے کا بار بنی رہے گی۔ عدالت  
 کا فیصلہ مجھے ذلت سے نہ بچا سکے گا۔ ۵

ثروت کا نتیجہ ہے عزت اور وقار۔ جب یہی نہیں تو ثروت کس کام  
 کی؟ اطمینان قلب کھو کر دنیا کی آنکھوں میں ذلیل بن کر۔ بے حیائی کا  
 بوجھ سر پر رکھ کر اور اپنے گھر میں نفاق بو کر ثروت اور دولت میرے کس  
 کام آئے گی؟ اور اگر سچ و صحت مجھ پر قہر الہی نازل ہو۔ تو میرے لئے منہ میں  
 کالک لگا کر گھر سے نکل جانے کے سوا اور کوئی علاج نہ ہو گا۔ نیک نیت

انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں  
سیہ کاروں پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ تو لوگ اُسے طعنے دیتے ہیں۔ اس  
حالت میں ایشور بے انصاف ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں ایشور  
کے انصاف کی تعریف ہوتی ہے۔ پر مانتا کسی طرح مجھے اس غار سے نکالو  
کیوں نہ جا کر میں بھان کنور کے پیروں پر گر پڑوں اور کہوں کہ مقدمہ اٹھا  
لیجئے۔ مائے انسوس! پہلے مجھے یہ بات کیوں نہ سنبھلی۔ اگر کل تک میں ان  
کے پاس چلا گیا ہوتا۔ تو سارے کا بن جاتے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آج  
توفیقہ کا دن ہے۔

منشی جی بہت دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبے رہے۔ لیکن کچھ  
فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کرنا چاہیئے۔

بھان کنور کو یقین ہو گیا۔ کہ اب گاؤں ہاتھ سے جاتا ہے بیجاری  
ہاتھ مل کر رہ گئی۔ رات بھر اُسے فیند نہیں آئی۔ رہ رہ کر منشی ست  
نرائن لال پر غصہ آتا تھا۔ ظالم! ڈھول بجا کر میرا پیاس ہزار کا مال  
لے جاتا ہے۔ اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آج کل کے یہ انصاف کرنے والے  
بالکل آنکھ کے اندھے ہیں۔ جس بات کو سارا زمانہ جانتا ہے وہاں تک  
بھی اُن کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ بس دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں  
کورے کاغذوں کے غلام! انصاف کے معنی ہیں دودھ کا دودھ اور  
پانی کا پانی۔ حق دار کو ملے۔ یہ نہیں کہ منصف صاحب خود ہی کاغذوں  
کے دھوکے میں آجائیں۔ اسی سے تو ایسے متفقہ جعلیے اور دغا باز آدمیوں

کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ لیکن خیر! گاؤں جاتا ہے تو جاتے۔ تم تو کہیں  
شہر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔

اس خیال سے بھان کنور کو کچھ تسکین ہوئی۔ دشمن کا نقصان  
ہمیں اپنے فائدے سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہ انسانی خاصہ ہے  
تم ہمارا ایک گاؤں لے گئے۔ نارائن چاہیں گے تو تمہارے ہاتھ  
سے بھی یہ جلدی نکلے گا۔ خود نرک کی آگ میں جلو گے اور  
تمہارے بعد تمہارے گھر میں کوئی نام لیوا نہ رہ جائے گا۔

فیصل کا دن آگیا۔ آج اجلاس پر معمول سے زیادہ مبہر بجاڑ  
تھی۔ اس مقدمہ سے ہر خاص و عام کو دلچسپی تھی۔ ایسے مقطع لوگ  
نظر آتے تھے جو بگلوں کی طرح سرکاری تقریبوں کے چشمہ شیریں  
کے کنارے ہی نظر آتے ہیں۔ مقدمہ اپنی نوعیت میں فرد تھا۔  
وکیلوں۔ مختاروں کی کالی پلٹن کا ہجوم تما شائیوں سے کچھ ہی کم تھا  
عین مقررہ وقت پر جج صاحب اجلاس پر نمودار ہوئے۔ وسیع  
ہال میں ساٹا چھا گیا۔ لوگ ہم تن گوش و چشم ہو گئے۔

اہلہ نے صندوق سے تجویز نکالی۔ اشتیاق نے لوگوں کا  
ایک ایک قدم اور آگے کھسکا دیا۔

جج نے فیصلہ سنایا ”مدعی کا دعویٰ خارج۔ فریقین اپنے اپنے  
مصارف کے ذمہ دار ہیں“ ہر جید عام قیاس اس فیصلہ کی جانب مائل  
تھا۔ تاہم آج جج کی زبان سے سن کر سارے مجمع میں ہلچل مچ گئی

جو اندیشہ تھا وہ واقعہ ثابت ہوا۔ مایوسانہ انداز سے سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ عدالت سے باہر نکلنے لگے۔

دفعۃً بھان کنور گھونگٹ نکالے اجلاس پر اگر کٹری ہوئی۔ جانے والے لوٹ پڑے۔ جو باہر نکل گئے تھے۔ پھر یک کر آگئے ساری جماعت دم بخود ہو کر بھان کنور کی طرف تلکنے لگی ایک ساحر تھا۔ جس نے انگلی کے اشارے سے ساری جماعت پر منتر ڈال دیا تھا۔

بھان کنور نے جج صاحب سے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا۔  
”سرکار کا حکم ہو تو میں ست نرائن لال سے کچھ پوچھو؟“

یہ ایک بے ضابطہ بات تھی۔ تاہم جج نے ازراہ انسانیت اس کی اجازت دے دی۔ تب بھان کنور نے ست نرائن لال کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لالہ جی! سرکار نے تمہاری ڈگری ڈگری تو کر ہی دی گاؤں متبیں مبارک ہے۔ مگر ایمان آدمی کا سب کچھ ہے۔ ایمان سے کہہ دو گاؤں کس کا ہے؟“

یہ سوال سن کر ہزاروں آدمی منشی جی کی طرف حیرت آمیز۔ استفسار کی نگاہوں سے تلکنے لگے۔ منشی جی دریائے نکر میں ڈوبے دل میں نفس اور ایمان کے داؤ پیچ ہونے لگے ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں اصل واقعہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا اتنے آدمیوں کے روبرو جھوٹی بات زبان سے نہ نکل سکی

غیرت نے زبان بند کر دی۔ ”میرا“ کہہ دینے میں کام بنتا تھا کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن بدترین گناہ کی جو سزا دُنیا دے سکتی ہے اس کے ملنے کا پورا خوف تھا۔ ”آپ کا“ کہہ دینے میں کام بگڑتا تھا۔ جیتی جتنائی بازی ہاتھ سے جاتی تھی۔ لیکن بہترین فعل کے لئے دُنیا جو انعام دے سکتی ہے۔ اس کے ملنے کی امید کامل تھی۔ اس امید نے خوف کو دبا لیا انہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا ایشور نے اُنہیں سرخرو بننے کا یہ آخری موقع دیا ہے۔ میں اب بھی اپنے ایمان کو بچا سکتا ہوں۔ اب بھی دُنیا کی نگاہوں میں عزت پاسکتا ہوں انہوں نے آگے بڑھ کر بھان کنور کو سلام کیا۔ اور کا پنتی ہوئی آواز سے بولے ”آپ کا“! فتح حق کا ایک نعرہ بلند کمرہ میں گونجتا ہوا عالم بالاتک جا پہنچا۔ حج نے کھڑے ہو کر کہا ”یہ قانون کا فیصلہ نہیں ایمان کا کا فیصلہ ہے۔“

داستان ختم ہو گئی۔ داستان نہیں امر واقعہ ہے۔ فریقین اب بھی شاید بقیہ حیات ہیں۔ ست نرائن لال سے جتنے ہی لوگ شاکی تھے اتنے ہی اب ان کے مداح ہو گئے۔ انسانی قانون پر خدائی قانون نے جو شاندار فتح پائی تھی۔ اس کے شہر میں مہینوں چرچے ہوتے رہے۔ بھان کنور ست نرائن لال کے گھر گئی۔ اُنہیں مناکر لائی پھر اپنا سارا کاروبار ان کے ہاتھ میں سونپا۔ اور کچھ دنوں میں وہی موضع منشی جی کے نام ہسبہ کر دیا۔ منشی جی نے بھی



اس کو اپنے تصرف میں لانا مناسب نہ سمجھا۔ کرشن آرپن کر  
 دیا اب اس کی آمدنی محتاج اور بیکسوں اور مسکین طلباء کی  
 امداد میں صرف ہوتی ہے ۔ ۵

---